خدوخالِ اقبال

۱۳۷۵ھ

محمد امین زبیری

خدوخال اقبال

۱۳۷۵ء

محمد امین زبیری

نام کتاب :- "خدوخال اقبال"

سال تصنیف :- ۱۳۷۵ھ/۵۶ :- ۱۹۵۵ء

اشاعت اول :- ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء

تعداد :- ایک ہزار

قیمت

RETAIL PRICE

ناشر :- ...ی

مطبع :- تھری-اے پرنٹرس ڈائرس
مارکیٹ ناظم آباد ۴/سی کراچی ۱۸۰۵)

ملنے کا پتہ :- بی-۱۳۲ بلاک ۱۰ گلشن اقبال کراچی

کتابت :- الف میم صدیقی
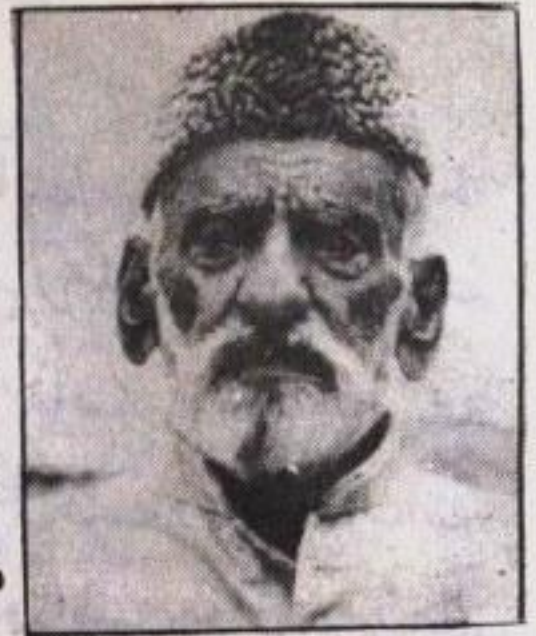
نام :۔ (مولوی) محمد امین زبیری

والد کا نام : (مولوی) امانت حسین شفا

ولادت : جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء

مولد : قصبہ دَرَو، ضلع نینی تال۔ یوپی (بھارت)

متوطن : قصبہ مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ یوپی (بھارت)

وفات : جمعہ ۵ ستمبر ۱۹۵۸ء مطابق ۲۰ صفر ۱۳۷۸ھ بمقام کراچی۔

سلسلۂ **نصب** :۔ زبیری، حواری رسول حضرت زبیر بن العوام کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو جب حجاج بن یوسف نے حرم کعبہ میں سفاکانہ قتل کر دیا تو آل زبیر کے کچھ خانوادے حجاز سے ترک وطن کر کے عراق اور افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں وارد ہوئے اور مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے قدیم اسلامی دار سلطنت منصورہ سے قریب کھنبایت (جسے عرب مورخین نے کنبایہ لکھا ہے جو بعد میں کنبہ بولا جانے لگا) میں متوطن ہو گئے۔ کم و بیش دو سو برس بعد سیاسی حالات سے مجبور ہو کر یہ لوگ پہلے ملتان اور پھر دہلی اور اس کے مضافات میں جا بسے۔ آل زبیر کی یہ شاخ چونکہ کنبہ سے نکلی تھی اس لئے ان کو شروع شروع میں تشخص کی خاطر وطنی نسبت سے کنبوی یا کنبوہ کہا جانے لگا

انہی زبیریان (کنبوی) میں سے محمد عمر زبیری (جو ہمایوں کے سپہ سالار تھے اور شیر شاہ سے جنگ میں مقتول ہوتے) کے بیٹے محمد اسمٰعیل زبیری کو ان کے والد کی خدمات کے صلہ میں شہنشاہ اکبر نے میرٹھ، بریلی، مراد آباد اور مارہرہ (ضلع ایٹہ) وغیرہ کے اضلاع میں ۳۶۵ گاؤں بطور جاگیر عطا کئے۔ محمد اسمٰعیل زبیری نے اتنی بڑی جائداد کے انتظام کے لئے مارہرہ (ضلع ایٹہ) کو اپنا مستقر بنایا۔ چنانچہ اسی وقت سے یہ شہر زبیریان کا اصل مرکز و مصدر چلا آرہا ہے (ماخوذ از کتاب زیست سوانح عمری

الحاج محمد زبیر زبیری و مقالہ از انیس مصطفٰے امینا زبیری مطبوعہ میگزین سیکشن روزنامہ جنگ مورخہ ۱/۱۱/۸۵ء)

تعلیم: ابتداً اپنے والد مولوی امانت حسین شفا سے اردو، فارسی وغیرہ نیز دینی تعلیم حاصل کی پھر رامپور کے سرکاری اینگلو ورناکیولر اسکول میں کچھ عرصے ہی پڑھنے پائے تھے کہ والد کے انتقال کی وجہ سے معاشی حالات نامساعد ہو گئے تو باقاعدہ مکتبی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور تلاش معاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بعد میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جو کچھ علمی استعداد اور اہلیت پیدا کی وہ صرف ذاتی مطالعہ کا حاصل تھا۔ جس کا اظہار مختلف موضوعات علم و ادب پر ان کی کم و بیش ۲۴ تصنیفات و تالیفات اور برصغیر کے مقتدر جرائد میں شائع شدہ ان گنت مقالات سے ہوتا ہے۔

معاشی جدوجہد: تلاش میں گھر سے رخصت ہو کر پہلے ریاست گوالیار، پرتاب گڑھ، بارہ بنکی وغیرہ کے محکمات بندوبست اراضی سے وابستہ رہے لیکن یہ ملازمتیں چونکہ ان کے مذاق سے ہم آہنگ نہ تھیں اس لئے بمبئی کا رخ کیا جہاں کچھ عرصے تگ و دو کے بعد بالآخر روزنامہ مسلم ہیرالڈ سے کالم نویسی پر منسلک ہو گئے کچھ عرصے بعد حاجی رحمت اللہ حاجی داؤد میمن سے ملاقات ہو گئی اور ان کی طرف سے نکاح بیوگان کی ترغیب کے لئے قلیل مشاہرے پر مختلف اخبارات و رسائل میں مضامین لکھتے رہے۔ اسی دوران نواب محسن الملک تک رسائی ہو گئی جنھوں نے ان کی تحریروں کو بہت پسند کیا اور بحیثیت اپنے پرسنل اسسٹنٹ ۲۳ روپیہ ماہانہ پر تقرر کر لیا۔ نواب صاحب کے ساتھ کافی عرصہ تک تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیں جس کی بناء پر نواب صاحب کا ان کے ساتھ بہت ہی مشفقانہ استاد کا تعلق قائم ہو گیا۔

زبیری صاحب کی صلاحیت ذوق و شوق اور تصنیفی معیار کو سراہتے ہوئے نواب صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ان کا تذکرہ سیرت النبیؐ کے دیباچہ میں کیا

جائے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی نے جلد اوّل میں ان کی پُرخلوص خدمات کا ذکر کیا ہے۔

بعد میں نواب صاحب کی سفارش پر بدرالدین طیب جی کے اخبار "مراۃ الاخبار" میں جو بمبئی سے نکلتا تھا، نائب مدیر مقرر ہوئے اور کچھ ہی عرصہ بعد نواب صاحب کی امداد سے اپنا اخبار "سفیر" جاری کیا۔

نواب صاحب کے ساتھ کام کرنے کے دوران ہی ان کی دوستی مولوی عبدالحق اور مولانا ظفر علی خاں سے جو ان دنوں بمبئی میں ہی مقیم تھے قائم ہوئی مگر نواب محسن الملک کے علی گڑھ اور مولوی عبدالحق اور ظفر علی خاں کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد زبیری صاحب نے بھی بمبئی چھوڑ دیا اور بھوپال چلے گئے۔

وہاں پہنچ کر پہلے ملّا غلام حسین بوہرہ کی دکان پر بطور محاسب اور مقدمات کے پیروکار کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ایک بہت با اقتدار وکیل سید عبدالعزیز کے ساتھ بطور ان کے اسسٹنٹ کے وابستہ ہو گئے یہ وابستگی اس حد تک مستحکم ہوئی کہ وکیل صاحب کے گھر میں ان کی حیثیت بڑے بیٹے کی سی ہو گئی اور زبیری صاحب کا ان کے بیٹوں سے یہ تعلق تا دمِ زیست رہا۔

وکیل صاحب جب حکومت کی مجلس مشاورت کے جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہو گئے تو انھوں نے زبیری صاحب کو اسی محکمے میں عارضی ملازمت دلا دی۔ اسی دوران میں والیٔ ریاست سلطان جہاں بیگم کو اپنے لئے ایک لٹریری اسسٹنٹ کی ضرورت پیدا ہوئی۔ دیگر ناموں کے ساتھ زبیری صاحب کا نام بھی پیش ہوا۔ باقاعدہ امتحان لیا گیا۔ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ ان کی تحریر والیٔ ریاست نے بہ نفسِ نفیس پسند فرمائی اور ۴۰ چالیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر روبکاری خاص میں ان کا تقرر ہوا۔ تقریباً ۲۴ سال بیگم بھوپال سے ان کا اتنا قریبی ربط رہا کہ دوسرے اعلیٰ افسران رشک کرتے تھے۔ ساری ملازمت میں وہی ان کی براہِ راست افسر رہیں چونکہ وہ تعلیم نسواں میں گہری دلچسپی لیتی تھیں۔ اس لئے اس سلسلے میں انھوں نے بہت کام کیا۔ ایک سرکاری رسالہ "ظلّ السلطان" کا اجراء زبیری صاحب کی ادارت

میں ہوا۔ وہ اکثر بیگم بھوپال کے ساتھ دوران سفر بھی شاہی عملے میں شامل ہوتے اور ہر خوشی کے موقع اور تقریبات پر انعام واکرام اور تحائف سے نوازے جاتے ۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۱ء مختلف موضوعات علم وادب پر تصنیفی فتوحات حاصل کرتے رہے۔

۱۹۳۱ء میں ان کے انتقال کے بعد زبیری صاحب نے فوراً پنشن کی درخواست دیدی اس لیئے کہ بقول خود ان کے اتنے طویل عرصے براہ راست بیگم صاحبہ سے منسلک رہنے کے بعد نئے ماحول میں ملازمت کرنا اور درباداری ان کے لیئے مشکل تھی۔ نواب حمید اللہ خاں جن کے حق میں بیگم صاحبہ سبکدوش ہوچکی تھیں بچپن سے ہی زبیری صاحب کو قریبی طور پر جانتے تھے انہوں نے ۲۰۰ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی جو وہ اپنے انتقال تک پاتے رہے۔

پنشن کے بعد اپنے بیٹے اور دو بھتیجوں کی تعلیم کی خاطر علی گڑھ میں اقامت گزیں ہوگئے۔ وہاں کے قیام کے دوران یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر سید راس مسعودؔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے خصوصی اور دیگر پروفیسروں سب ہی سے قریبی رابطہ رہا۔ ویسے زبیری صاحب کے تعلقات برصغیر کے تمام ہی مشاہیر علم وادب سے قائم رہے جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اول الذکر سے تو ان کی دوستی تقریباً ۷۰ سال رہی۔

زبیری صاحب، علی گڑھ تحریک پر ایک اتھارٹی تھے۔ سر سید کے قائم کردہ ایم اے او کالج سے یونیورسٹی تک کے بارے میں زبیری صاحب کی متعدد تصانیف ہیں جن کے اقتباسات مختلف مصنفین اپنی تصنیفات میں شامل کرتے رہتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی آگئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔

جمیل زبیری

پیش گفت

(از انیس شاہ جیلانی)

اقبالؔ بے حد وجیہہ انسان تھے، شخصیت ایسی جاذب نظر تھی کہ ہر شخص کھنچا چلا آتا تھا، جن میں سے عطیہ فیضی کی شخصیت نمایاں ترین ہے۔ جو حسن و جمال اور علم و ہنر کا پیکر تھیں۔ انہیں ایک جگہ لکھتے ہیں "وہ جو آپ کا روزنامہ فرنگ اخباروں میں چھپ رہا ہے اور ہر ایک کی زبان پر ہے، داد طلب ہے۔ میں بھی ثنا خواں ہوں" جواب یہ ملا کہ "حضور، وہ ہم نہیں ہماری بہنا لکھتی ہیں" اور پھر یہ سن کر اور پرا ہلنے کہ "آپ شاعر اور فلسوف بھی ہیں، یہ ہم نے کہیں نہیں سنا"۔ لاہور کے مشاعروں اور ادبی جرائد میں چھپنے چھپانے کو جانے دیجئے، یہاں تو لندن جانے سے پہلے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کو گرمانا بھی کام نہ آیا۔ یہ جان کر انجان بننے کی کشمکش دونوں کو اتنا قریب سے قریب تر لے آئی کہ جیتے جی کوئی کسی کو نہ بھلا سکا عطیہ اور جرمن مس ویگے ناست نے وارفتہ محبت ناموں کو تمامتر تجاہل عارفانہ کے باوجود حرز جاں بنا کر رکھا۔ اے کاش یہ توفیق اقبالؔ کو بھی ارزاں ہوئی ہوتی۔ کیا عجب یہ ممکن ہوا ہو مگر نادان اقبالیوں کے ہاتھوں ان جوابی نگارشات کا قصہ پاک ہو گیا ہو۔ صرف چودھری محمد حسین ہی نہیں اس حمام میں اور بھی پائے جاتے ہیں۔ اقبال کی افتادِ طبع کے واقعات کچھ تو یاروں سے ہی چھپائے نہ چھپے اور مزید سینہ گزٹ میں بھی شائع ہوتے رہے۔ انہیں سنجیدگی سے لئے جانے میں قباحت کیا

ہے، یہ جامے پلے پڑنے والی بات نہیں ہے۔ یہاں ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جس کے راوی خلیفہ عبدالحکیم اور رئیس احمد جعفری، دونوں معروف اقبالی ہیں علی بخش جیسا کہ سب جانتے ہیں، عنفوانِ شباب ہی سے مثل نفسِ ناطقہ بن چکا تھا اور ہر طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہونے اور رہنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا معیارِ حسن علامہ کے حسنِ نظر سے کیسے لگا کھا سکتا تھا؟ چنانچہ اونچی شلوار نے رگِ ظرافت کو پھڑکایا اور ٹانے کا ایک بہانہ ہاتھ آیا کہ "یہ تم کس دھابن کو لے آئے؟" دھتا بتانے کے لئے اس سے بڑھکر شوخ و شریر اور بلیغ جملہ اور کون کس سکتا تھا؟

اقبالؔ کی پہلی بیوی سے ہزار جتن کے باوجود مفاہمت نہ ہو سکی۔ بنائے مخاصمت کیا تھی یہ کسی "اقبالی" نے نہیں لکھا۔ اگر لکھا تو بس یہ کہ "اس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔" اب یہ ناگفتنی کسی سے اگلوائے کون؟ آفتاب اقبال مرحوم کی ایما سے سید حامد جلالی نقوی نے جون ۱۹۶۷ء میں "علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" اور ستمبر ۱۹۶۹ء میں شیخ عطا محمد کے خطوط" شائع کئے تھے جن میں موصوفہ کی بے گناہی اور مظلومیت کے تمام دستاویزی ثبوت پیش کر دیئے تھے، مگر وہ بھی غائب کر دی گئیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری جو کسی کے کانوں میں بھنک پڑ سکے۔ خیر مگر اقبالؔ کا وصیت نامہ تو شائع ہو چکا ہے جس کی رو سے کریم بی بی اور ان سے پیدا ہونے والے خود اپنے بیٹے آفتاب اقبال کو منقولہ یا غیر منقولہ املاک میں سے ایک حبہ کے لئے بھی وصیت نہیں کی، حالانکہ اخلاقاً، شرعاً اور قانوناً ان کا حق بنتا تھا۔ مگر ان مظلوموں نے کسی صورت میں چارہ جوئی نہیں کی۔ مذکورہ دونوں شواہد ناپید سہی۔ یہ وصیت نامہ ہی ان کی مظلومیت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

زبیری مرحوم سے میری تقریب ملاقات کیا تھی، اب یاد نہیں۔ شاید "خطوطِ شبلی بنام عطیہ" کے مطالعہ سے ہی مراسلت کی تحریک ہوئی ہو۔ اس مختصر سے مجموعے کو بابائے اردو نے اردو زبان کا زیور کہا ہے۔ مگر اسی کی بناء پر یاروں نے زبیری مرحوم کو شبلی دشمنوں کا خیلی بنا دیا۔ جب مرحوم نے اقبال پر بھی قلم اٹھایا تو تعریف تو سبھی نے کی اور تقاضہ بھی کیا کہ چیز ایسی ہے کہ چھپنی ہی چاہیے مگر بدنام اتنے ہو چکے تھے کہ باوجود دلی لگانگت کے

بابائے اردو بھی اشاعت کے معاملہ میں ہمت نہ کرسکے۔ میں نے بابائے اردو پر بھی سبقت لے جانے کی کوشش کی تو آبا مرحوم کی ڈانٹ پڑی کہ "چند ٹکوں کیلئے اقبال مرحوم کی پگڑی اچھالتے ہو؟" نتیجۃً زبیری مرحوم سے مسودہ کے حصول کے لئے جو سلسلہ مراسلت دسمبر ۱۹۵۶ء سے چل رہا تھا وہ ٹوٹ گیا۔

اس قصہ کو تیس برس بیت گئے جو ایک عمر ہوتی ہے۔ اب تو گردشِ ایام سے اقبالیات کی اس جہت کا دلچسپ مواد یورپ تک سے یہاں آپہنچا ہے۔ اُدھر حیدرآباد دکن سے رازہائے درون پردہ بے نقاب ہو رہے ہیں جس سے علامہ کے نقرو توکل کے حقائق کھل رہے ہیں۔ مگر ان انکشافات کے باوجود میں زبیری مرحوم کی اس محققانہ قلمی کاوش کی اشاعت سے مایوس ہو چکا تھا اور یقین ہو چلا تھا کہ مرحوم کی یہ محنت رائیگاں جاچکی ہے اور یہ گمان بھی نہ تھا کہ کبھی "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" بھی ہوسکتا ہے جو عمران زبیری کی صورت میں ہوا۔ جس کے نتیجہ میں زبیری مرحوم کی یہ متاعِ گم گشتہ تخلیق سے ۳۰ برس اور ان کی وفات سے ۲۰ برس بعد پہلی بار اقبال شناس (و) کے جویاؤں کے مطالعہ کے لئے پیش کی جارہی ہے۔ اس کی اشاعت کے سلسلہ میں مرحوم کے منقولہ ذیل دس خطوط بھی قارئین کی خدمت میں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اگرچہ یہ پہلے بھی ۱۹۶۵ء میں "نوازش نامے" میں شامل ہو چکے ہیں، جو میرے نام چند معروف اصحابِ علم و فکر، قلمکاروں کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

(لفافہ - ۱۹۵۶ء)

۷ دسمبر　　　　　　　　ع۳۲ اک اک اسکول کلفٹن
کراچی۔

مکرم محترم　　　تسلیم

آپ کا محبت نامہ کل موصول ہوا ۔ خطوط شبلی سے اغلباً کتاب "شبلی کی رنگین زندگی" مراد ہے ۔

آپ "ذکر شبلی" ملاحظہ فرمایئے جو حیات شبلی پر تنقید ہے اس سے اصل حالت معلوم ہوتی ہے کہ کیسی تدلیس و تلبیس ہے ۔ یہی حالت علامہ اقبال کی سوانح عمریوں کی ہے ۔ میں نے ان پر بھی ایک تنقید لکھی ہے ۔ "خدوخال اقبال" تاریخی نام ہے لیکن اپنی ضعیف العمری اور علالت کی وجہ سے نظر ثانی نہیں کر سکا ۔

میری عمر ۸۶ سال میں ایک مہینہ کم ہے کوئی تصویر نہیں اور تصویر کا کیا ہوگا اب تو سکون کو دل چاہتا ہے ۔

"خدوخال اقبال" بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہوگی ۔ پاکستان یا تقسیم ہند کا تو دور کا واسطہ بھی نہیں یہ صرف بزم اقبال وغیرہ کا پروپیگنڈا ہے ۔ معاف فرمایئے میرے متعلق آپ نے حسن ظن سے زیادہ کام لیا ہے ۔ ورنہ "من آنم کہ من دانم" زیادہ شوق ملاقات ۔

خاکسار
محمد امین زبیری

(مکتوب اول سے منسلک ایک مطبوعہ فہرست)

فہرست کتب مؤلفہ

تذکرے اور سوانح حیات

	صفحات	سنہ تالیف	
۱۔ بیگمات بھوپال مصور	۲۱۵	۱۹۱۸ء	خاندان فرمانروا کی دس بیگمات کا تذکرہ ۱۷۰۱ء - ۱۹۱۷ء

	صفحات	سنہ تالیف	
۲۔ افتخار الملک	۸۸	۱۹۴۶ء	افتخار الملک ہز ہائنس نواب محمد حمید اللہ خان بہادر بی اے (علیگ) کا تذکرہ
۳۔ عصر جدید	۱۶۸	۱۹۲۷ء	ہز ہائنس کے حالات مسند نشینی و سفر علی گڑھ
۴۔ حیات سلطانی	۳۶۳	۱۹۳۴ء	فردوس آشیاں نواب سلطان جہاں بیگم یرد اللہ مضجعہا کی سوانح عمری
۵۔ تذکرہ وقار	۴۰۰	۱۹۳۳ء	مولوی مشتاق حسین وقار الدولہ وقار الملک، آنریری سیکرٹری ایم اے او کالج و بانی مسلم لیگ کا تذکرہ
۶۔ تذکرہ محسن	۳۴۳	۱۹۳۴ء	مولوی سید مہدی علی خاں محسن الدولہ محسن الملک سیکرٹری ایم اے او کالج کا تذکرہ
۷۔ پرنس آغا خاں	۳۰۰	۱۹۵۰ء	والا حضرت شمس الہمایوں سلطان محمد شاہ آغا خاں کا تذکرہ
۸۔ ضیائے حیات	۳۶۱	۱۹۵۲	ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی سوانحعمری

مختصر تذکرے

۹۔ جسٹس سید محمود	۴۰	۱۹۲۵ء	بسلسلہ یادگار رشیر پاشا
۱۰۔ مولانا حالی	۵۵	"	سیر یزا ٹادہ
۱۱۔ یاد انوار	۹۹	۱۹۳۵	مولوی انوار احمد سفیر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تذکرہ

تاریخ

کتاب	صفحات	سنہ	کیفیت
۱۲۔ مختصر تاریخ مسلم یونیورسٹی	۵۸	۱۹۳۴ء	ایم اے او کالج اور یونیورسٹی کی مختصر تاریخ
۱۳۔ علی گڑھ	۳۱	۱۹۵۲ء	کتابچہ تاریخی۔
۱۴۔ انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ	۱۳۴	۱۹۳۷ء	برطانوی تسلط اور مسلم سیاسیات ۱۹۴۰ء تک کی مفصل تاریخ
۱۵۔ مسلمانان ہند کی سیاست وطنی	۳۲۰	۱۹۳۸ء	
۱۶۔ سیاست ملیہ	۶۱۸	۱۹۴۱ء	

متفرق

کتاب	صفحات	سنہ	کیفیت
۱۷۔ مکاتیب	۱۵۰	۱۹۲۴ء	محسن الملک اور وقار الملک کے خطوط کا مجموعہ
۱۸۔ خطوط شبلی مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالحق	۱۲۲	۱۹۲۵ء	خطوط بنام عطیہ بیگم فیضی و زہرا بیگم فیضی کا مجموعہ
۱۹۔ ذکر شبلی	۲۴۱		حیات شبلی مولفہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی پر تنقید اور مولانا شبلی کا مختصر تذکرہ
۲۰۔ شبلی کی رنگین زندگی	۹۶	۱۹۵۲ء	مولانا کے خطوط و شاعری پر تبصرہ و تنقید طبع ثانی
۲۱۔ عورت اور عسکریت مصور	۴۸	۱۹۴۷ء و ۱۹۵۲ء	مسلمان عورتوں کی تاریخ عسکریت اور پاکستانی عورتوں کی فوجی تربیت
۲۲۔ گیارہ قصے	۷۱	۱۹۲۶ء	اصلاحی افسانے
۲۳۔ نساء الاسلام کی تعلیمی تاریخ		۱۹۵۱ء	زیر طبع
۲۴۔ تذکرہ سرسید		۱۹۵۳ء	زیر طبع

نوٹ:۔ مندرجہ فہرست کتب میں کتب مندرجہ ع ۷ کھارادر اسمٰعیلیہ ایسوسی ایشن، ع ۸ ڈاکٹر محمد یٰسین زبیری جنرل سیکرٹری ڈاکٹر ضیاء الدین احمد میموریل کمیٹی، ع ۱۹ مکتبہ جدید لاہور ع ۲۰ عمر فاروق پبلشر مال روڈ لاہور ع ۲۳ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ع ۲۴ سرسید اسکول راولپنڈی سے مل سکتی ہیں باقی نایاب ہیں۔

محمد امین زبیری

متوطن قصبہ ماہرہ متصل علی گڑھ سابق مہتمم دفتر تصنیف علیاحضرت سرکار عالیہ بھوپال فردوس آشیاں و مدیر ماہنامہ ظل السلطان حال مہاجر پاکستان (کراچی)

پتہ لکھنے کا انداز: بخدمت جناب سید انیس شاہ صاحب

محمد آباد ڈاک خانہ

سنجر پور بہاولپور

(۲)

(مہر ڈاک خانہ کراچی ۱۴ دسمبر ۵۶ء)

جناب محترم تسلیم

والا نامہ کا شکریہ۔ میری نسبت آپ کا حسن ظن بہت زیادہ ہے۔

جو نایاب ہیں وہ نایاب ہی ہیں البتہ کسی کسی کے پاس نظر آجاتی ہیں دو کتابیں شبلی کے متعلق لاہور سے مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتی ہیں، ضیائے حیات کی قیمت چھ روپیہ ہے۔ تذکرہ وقار اور حیات سلطانی، سیاست ملیہ بھی ایک صاحب کے پاس ہیں مگر یہ تینوں کتابیں تیرہ روپیہ میں مل سکتی ہیں، غرض یہ چاروں کتابیں ۱۹ روپیہ اور ۲ دو روپیہ تخمیناً محصول ڈاک ارسال کریں تو بھجوا دوں۔

علامہ اقبال پر میری تنقید شاعرانہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کی سیرت پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان پر انہی کے خطوط سے تنقید ہے مثلاً ان کا مشہور شعر ہے

کہ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

مگر وہ ایک ہندو امیر کو خط لکھتے ہیں کہ میری تقدیر آپ کے ہاتھ میں ہے اس سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، قصر امرا کے گرد اینے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن امراء کی مدح و ستائش ان کا خاص شغلہ ہے، غرض اپنے خطوط سے اقبال وہ نہیں جو اشعار میں ہے۔ سیاسیات میں وہ معمولی آدمی ہیں مگر پروپیگنڈہ نے ان کو ہیرو بنا کر تصور پاکستان ان سے ہی

منسوب کردیا حالانکہ یہ تصورات ۱۹۱۸ء سے تھا اور ۱۹۲۰ء میں ایک اسکیم بھی شائع ہو چکی تھی پھر لیگ میں بھی یہ بیان آیا غرض اقبال سے پہلے کا یہ تصور ہی نہیں بلکہ بحث ہے، مختصر اً حلقۂ پرستاران اقبال میں ایک ہیجان پیدا ہوجائے گا مگر جواب کسی کے پاس نہ ہوگا اگر آپ تیار ہوں تو میں مسودہ دے دوں گا۔ اس کتاب کے متعلق بالمشافہ گفتگو کی ضرورت ہے، میں بیمار ۸۰ سال کی عمر میرے لئے سفر ممکن نہیں، آپ خود تکلیف فرمائیں اس کا تاریخی نام "خدوخالِ اقبال" ہے
۱۳۷۵ھ

عطیہ بیگم میکلوڈ روڈ ایوان رفعت پتہ ہے، مری خاص عنایت فرما ہیں۔ آپ آئیں تو کئی باتیں طے ہوجائیں گی، آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں اس وقت ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے اور ایک وقت میں زیادہ لکھنے سے بھی قاصر ہوں، یہ عریضہ بر سبیل استعجال لکھ دیا ہے۔ لفافہ ٹکٹ کی زحمت نہ فرمایئے

خادم

محمد امین زبیری

۱۳/۲ اک اک اسکول کراچی

(۳)

(لفافہ) ۲۵ دسمبر ۱۹۵۶ء

مکرم محترم تسلیم نیاز

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ دسمبر موصول ہوا۔

کتاب کا نام میں نے "خدوخالِ اقبال" تجویز کیا ہے۔ مسودہ دیکھے بغیر آپ قیمت کا اندازہ صحیح نہیں کرسکتے، میں نے کبھی یہ سودا نہیں کیا تھا۔ البتہ کراچی کی مجبوریوں نے آمادہ کردیا۔ میں نے آغاخان کی لائف معاوضہ پر لکھی، پندرہ سو روپیہ علاوہ دیگر مصارف کے۔ میری کتاب "عورت اور عسکریت" کا معاوضہ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ نے بار دوم شائع کرنے کا اور صرف ایک اشاعت کے لئے تین سو روپیہ دیا۔ یہ کتاب عورتوں کی عسکری تاریخ ہے۔ بار اول حیدرآباد دکن میں شائع ہوئی تھی اب بار ثالث میرے ہی ایک عزیز شائع کررہے ہیں، عورتوں کی تعلیمی تاریخ حال میں شائع ہوئی ہے۔ کانفرنس ناشر سے پانچسو

روپیہ، معاوضہ۔

اصل یہ ہے کہ آپ دیکھ کر ہی اندازہ کر سکتے ہیں، زیادہ انسب ہوگا کہ آپ ہی لکھیں کہ کیا ادا کر سکتے ہیں۔ کتاب مطبوعہ کے ۲۰۰ صفحات ہو جائیں گے میں نے تمام کتاب میں حوالوں سے ہی کام لیا ہے، بہر حال آپ آئیے اور دیکھ کر رائے قائم کیجئے۔

اپنے والد صاحب کی خدمت میں بھی سلام نیاز کہیئے۔

"سیاست ملیہ" کی علی گڑھ سے بمشکل تمام دس روپیہ فی نسخہ دو جلدیں ملی تھیں وہ فوراً وہ صاحب لے گئے جنہوں نے علی الحساب پہلے ہی قیمت جمع کرا دی تھی، حیات سلطانی صہ فی کاپی، یہ دونوں منگوانی پڑیں گی، ذکر شبلی تو لاہور میں مکتبہ جدید سے منگوا لیجئے عہ قیمت ہے اور شبلی کی رنگین زندگی، اشرف پبلشر سے ایک روپیہ قیمت ہے۔

اصل تو یہ ہے کہ اقبال کو جو فرشتہ بنانے کی کوشش ہے اس سب کا رد موجود ہے اور انہیں کے حوالوں اور بیانوں سے، مجھے اس تنقیدی کتاب پر یک گونہ ناز ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی مسودہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مخلص

محمد امین زبیری

۳/۱۲ اے کے اسکول کلفٹن کراچی

مہ ۱ تا ۴ نایاب صہ ۵ منگوائی جا سکتی ہے

ع ۱ تا ۳ نایاب عہ ۴ صہ ۵ منگوائی جا سکتی ہے

۶ " ۱۶، عہ ۱۵

ع ۷ قیمت عہ ۲/۸ عہ ۱۷، ۱۸ نایاب عہ ۱۹ مکتبہ جدید لاہور

مہ ۸ " ۶/ مجلد عہ ۲۰ عمر فاروق پبلشر لاہور

عہ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵ (نایاب) تذکرہ سرسید زیر طبع

(۳)

(لفافہ از کراچی)

۳ جنوری ۱۹۵۷ء

مکرم محترم تسلیم والا نامہ مورخہ دسمبر کا شکریہ

خدوخال اقبال کا حق تالیف زیادہ قابل گفتگو نہیں۔ آپ نے جو تجویز کیا ہے۔ وہ مجھے منظور ہے۔ یہ کتاب بڑے معرکہ کی ہے۔ آج کل اقبال کو انبیائے کرام کی صف میں ان کے سیرت نگاروں نے شامل کر دیا ہے۔ غلط واقعات اور تدلیس کے علاوہ واقعات کو چھپایا گیا ہے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے مگر انہوں نے جو اخلاقی اقدار پیدا کئے وہ بہت سے ایسے ہیں کہ ناممکن العمل مثلاً بہت مشہور شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مگر ان کے خطوط سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی تقدیر ایک ہندو امیر کے ہاتھوں میں دیدی، عزائم بہت بلند عمل ہیچ، بارگاہ الہٰی میں ادب کی حالت

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اسی طرح بہت سے اشعار ہیں، مدح امراء بھی ایک خاص موضوع ہے، ان کے بہت سے اشعار خارج کرکے تعریف ہے۔ میری کتاب دراصل ان کی سوانح عمریوں کی تنقید ہے واقعات اور انہی کے خطوط سے، اور اسی طرح اقبال کے اصلی خدوخال جن پر پوڈر ملا گیا ہے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی سیاست بھی ایک بڑا موضوع ہے۔ تصور پاکستان ان کی طرف بڑے زور کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ ان کا نمبر چھٹا ہے پانچ اصحاب پہلے ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۹ء

لہ میں نے معاوضہ ڈیڑھ دو روپے سے زیادہ تجویز نہیں کیا تھا فی صفحہ۔ انیس۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۵ء

یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں، ایک نے تو اسکیم بھی شائع کی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے تو پورا تصور بھی نہیں ظاہر کیا، غرض یہ کتاب اس نوعیت کی ہے لیکن میں نے خود کوئی تعریف نہیں کی بلکہ ہر ایک پوائنٹ کا ثبوت پیش کر دیا ہے اور ناقابل تردید۔

جب تک آپ مسودہ نہ دیکھیں اندازہ نہیں کر سکتے، مجملاً چند عنوان پیش ہیں۔

تمہید، شاعری کی تعریف، سیرت نگاروں پر تنقید، نقوش سیرت، ابتدائی حالات متاہل زندگی، اقتباس خطوط عطیہ بیگم، غیر ملکی لباس سے نفرت، شان فقر غیور، ایک نیشنل فنڈ، بلند ارادے، عملی زندگی، خطاب ، جنگ عظیم کے متعلق نظمیں، علیگڑھ تحریک، مدحت طرازی، خاص تعلقات، اقبال اور وزیر اعظم سر کشن پرشاد، نظام سے ملاقات شاہان افغانستان سے تعلق، سر سید راس مسعود سے درخواستیں اور وظیفہ بھوپال، سیاسیات عام سیاسی مصروفیات، تصور پاکستان کا تاریخی پس منظر، چوہدری رحمت علی کے ایک رفیق کا بیان، چند تعجبات، انتقال۔ یہ فہرست بہت مجمل ہے تاہم نصف اندازہ ہو جاتا ہے۔

میری مولفہ کتب میں ضیائے حیات چھ روپیہ، ذکر شبلی دو روپیہ، شبلی کی رنگین زندگی ایک روپیہ ۸ آنہ، تاریخ علیگڑھ ۸ آنہ یہاں کتب فروشوں کے یہاں ہیں، ایک نئی کتاب مسلم خواتین کی تعلیم یہ تاریخی ہے حال میں شائع ہے ۶ مگر یہ پانچوں یہاں دستیاب ہوتی ہیں اور عام قیمت ہے جو بازاری ہے، البتہ سیاست ملیہ نایاب ہے لیکن ایک صاحب کے پاس علی گڑھ میں چند نسخے ہیں وہ زیادہ قیمت پر دیتے ہیں حال میں دو صاحبوں نے دس دس روپے میں منگوائی، اسی طرح حیات سلطانی ۵ میں، اگر آپ منگوائیں تو ۶/۲۷ روپیہ بھیج دیں یہاں کی تو فوراً اور بھارت والی پندرہ بیس دن کے وقفہ سے ملیں گے۔

اپنے محترم والد صاحب کی خدمت میں سلام نیاز عرض کیجئے نامہ والا کا منتظر ہوں

مخلص

محمد امین زبیری

۲/۱۲ اک اک اسکول

بقسم خدائے لایزال، میرے پاس کوئی تصویر میری نہیں، پیر حسام الدین راشدی کے پاس ہے، انہوں نے خود اتاری، ذرا موسم صاف ہو تو ان سے کاپی لے کر پیش کر سکوں گا۔

مکرر۔ پرنس آغا خاں بھی مل جائے گی تین روپیہ قیمت ہے۔

(۵)
(الف)

۸ جنوری ۵۸ء

مکرم تسلیم آپ کا خط مورخہ ۵ جنوری ۵۸ء آج موصول ہوا،

میرا شغل تصنیف و تالیف پیشہ ورانہ نہیں، میں ۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۱ء فردوس آشیاں بیگم صاحبہ بھوپال کا لٹریری اسسٹنٹ اور ایک بڑے دفتر کا انچارج تھا جس کا تعلق مصنفین وغیرہ سے بھی رہتا تھا۔ دفتر میں ہمیشہ تین چار ادیب و مصنف میرے ماتحت تھے، خدا کا شکر اور بھوپال کا احسان ہے کہ مجھے میرے گزارہ کے قابل پنشن ملتی ہے، البتہ مہاجرت نے گذارہ گراں تر بنا دیا ہے، مہاجرت سے پہلے میری جس قدر کتابیں شائع ہوئیں وہ میرے شوق کا نتیجہ تھیں اور صرف یہ خیال رہتا تھا کہ گرہ سے خرچ نہ ہو اور نفع اتنا ملے کہ اپنے دوستوں کو اور لائبریریوں کو ہدیہ دے سکوں۔

پنشن کے بعد البتہ یہ خیال چھوڑنا پڑا کیونکہ اب بچوں کی تعلیم کا بار تھا، چنانچہ علیگڑھ کی تاریخ پر کام معاوضہ سے کیا، دو ہزار طے ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی موت اور اس انقلاب نے وہ کتاب مکمل نہ ہونے دی، مگر اب یہاں ایک پریس نے میری بقیہ رقم دے کر کتاب لے لی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال کی لائف لکھنے کو طلب کر لیا گیا اور پانچ ہزار معاوضہ پر مامور ہوا سال بھر میں تیار کر دی، آپ سرکاری مراسلت سے اندازہ کر سکیں گے حالانکہ مجھے بھر طلب کر کے یہ کام قانوناً لیا جا سکتا تھا، اسی دوران میں پنشن بھی ملتی رہی،

مہاجرت کے بعد تکالیف مالی نے مجبور کر دیا، آغا خاں کی لائف کا پندرہ سو روپیہ معاوضہ اسمٰعیلیہ ایسوسی ایشن نے علاوہ دیگر اخراجات صفائی مسودہ وغیرہ کے دیا۔ عورت اور عسکریت

ے سکنڈ ایڈیشن کا معاوضہ تین سو روپے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے دیا۔

اس تمہید کے بعد یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے خط کے ایک فقرہ پر کہ "کم ازکم دنیا کو تصویر کا دوسرا رخ نظر تو آجائے گا" بے ساختہ خیال کیا کہ

سپردم بتو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

خدا کرے ہمارے نوجوان ایسے ہی خیال کے ہو جائیں تو یہ ملمع کاریاں نہ ہو سکیں، اب معاملہ معاملہ کی طرح کیجئے، مسودہ غیر صاف شدہ ہے۔ صفحات کہیں باریک لکھے ہیں کہیں موٹے کہیں کٹے پٹے ہیں، کہیں حاشیوں پر اس سے صفحات کا اندازہ نہیں ہوگا بلکہ مطبوعہ سے ہو سکے گا۔ اگر صاف کرایا جائے تو بھی صحیح نمبر معلوم نہ ہوں گے لہٰذا صفحہ مطبوعہ کی مناسبت رکھی جائے دیکھئے دوبارہ طباعت کی نوبت جب ہی آئے گی کہ طبع اول ختم ہو اور ظاہر ہے کہ یہ علامت قبولیت ہوگی، دائمی حق کے ساتھ، اشاعت مابعد پر فی صد مقرر کیجئے۔ اور مجھے نہ دیجئے کسی یتیم خانہ کو دیجئے، خواہ وہ بہاولپور کا ہو ورنہ کراچی کا یتیم خانہ بہت اچھا کام کر رہا ہے، ۲۵ کاپیاں مجھے بھی دینی ہوں گی۔

میں مسودہ آپ کے سپرد کر دوں گا اور رقم آپ مجھے ادا کریں گے۔ جو صفحات زیادہ کٹے پٹے ہوں گے وہ یہاں تین چار دن میں صاف ہو جائیں گے آپ کا خود آنا ضروری ہے اور چیزیں بھی تیار ہو رہی ہیں۔

میرے ایک بھتیجے نے جو قائداعظم کے ساتھ بہت رہے ایم اے ایل بی ہیں ۱۹۴۲ء میں انگریزی میں مسلم انڈیا لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اسی زمانہ میں میں نے سیاست ملیہ لکھی، مواد پر بہت صرف ہوا مگر دونوں نادر تھیں بہت مقبول ہوئیں اب میرے ایک ایم اے میرے نے سیاست ملیہ کو ۱۹۴۰ء تک ملخص کیا ہے اور ۱۹۶۱ء تک واقعات اضافہ کئے ہیں۔ میں نظرثانی کر رہا ہوں۔

میرے فرزند محمد یامین زبیری نے پاکستان "اسٹیپ بائی اسٹیپ" انگریزی میں فلسکیپ صفحہ کی تاریخ لکھی ہے عہد سرسید سے قائداعظم کے گورنر جنرل ہونے تک کے سیاسی اہم حالات ہیں، ایک پریس نے ان سے مسودہ لیا مگر چونکہ وہ انگلینڈ چلے گئے ہیں معلوم نہیں کیا طے ہوا پریس والے ان کے دوست اور علیگڑھ کے کلاس فیلو ہیں۔

عورت اور عسکریت میں اضافے کئے ہیں اور ایک عزیز ڈاکٹر یسین زبیری اس کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ صرف میرا مشغلہ اور شوق ہے جو مری مدد ان سب کے ساتھ ہے۔

اب کوئی معاملہ نہیں رہا، یہ یاد رکھئے کہ وعدۂ فردا پر کل معاملہ نہ ہوگا۔ آپ نے لکھا ہے جتنے صفحے بنتے ہیں تو یہ تو طباعت کے بعد اور سائز کے تعین، کتابت کے طرز پر منحصر ہے، ایک سائز پر جو مضمون نصف صفحہ میں ہوگا۔ وہ بھی دوسرے سائز میں پون صفحہ اور پورا صفحہ لے گا عموماً سائز ۱۸×۲۳/۸ طباعت و کاغذ میں کفایت رہتی ہے اس سائز پر جتنے صفحے ہوں۔

آپ کو کتاب منتقل کرنے کا حق نہ ہوگا یعنی آپ کسی سے معاملہ کریں کہ وہ آپ کو ایک رقم دے اور آپ اس کو حق اشاعت دے دیں کتاب یقیناً بہت قابل غور اور دلچسپ ہوگی۔ میں نے مولانا سید سلیمان مرحوم کی کتاب حیات شبلی پر دو سو صفحہ کا تبصرہ کیا تھا اور حق تالیف بحق انجمن ترقی اردو ہبہ کیا، انجمن کی اجازت ایک صاحب نے اس شخص سے منتقل کرالی اور صرف دو سو کاپیاں شائع کرکے باقی نیازمندان سلیمانی کے نذر کرکے تلف کرادیں اس کا خلاصہ ذکر شبلی لاہور کے مکتبہ جدیدہ نے شائع کیا ہے، میں نے اس اتلافات کا ذکر اس خلاصہ میں کر دیا ہے، بہر حال ان تمام امور پر غور کرکے رائے قائم فرمائیے۔ جو کتابیں یہاں ملتی ہیں اور دوسری جگہ سے منگائی ہیں ان کی قیمت جلد بھیجئے ورنہ ان کا ملنا بھی مشکل ہوگا، آپ کے لئے میں نے محفوظ کرادی ہیں مگر زیادہ انتظار تو ممکن نہیں۔

مخلص

۱۲/۲ اک اک اسکول کلفٹن کراچی   محمد امین زبیری

(۶)

(کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ کلفٹن کراچی، ۲ جنوری ۱۹۵۷ء)

حضرت سلامت۔ عنایت نامہ ہائے پیہم کے بعد یہ خاموشی کیا معنی ۱۰ جنوری کے بعد آپ نے پھر کوئی خط نہیں لکھا خدا کرے آپ مع الخیر ہوں

بہاولپور میں میجر شمس الدین صاحب سے آپ واقف تو ضرور ہوں گے ان کی کتاب اسلامی نظریۂ تعلیم جو قرآن مجید کے احکام وغیرہ پر ہے آپ نے دیکھی ہو گی، واقفیت کے علاوہ آپ کے تعلقات کیسے ہیں، یہ میں ایک خاص ضرورت سے دریافت کر رہا ہوں اور شاید آپ کو پھر تکلیف دوں۔

خادم

محمد امین زبیری

۱۲/۲ اک اک اسکول کراچی

(۷)

(کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ کلفٹن کراچی ۱۹ جنوری ۱۹۵۷ء)

مکرم تسلیم۔ ۱۷ جنوری کے خط سے اطمینان ہوا کہ بفضلہ خیریت ہے۔ میرے کارڈ کا جلد جواب دیجئے۔

میں نے آپ کے لئے کچھ کتابیں محفوظ کرادی ہیں بک سیلر کا تقاضا ہے علیگڑھ کو بھی لکھ دیا ہے وہاں سے بھی عنقریب آجائیں گی یہ روپیہ تو بھیج دیجئے کوئی بڑی رقم نہیں آپ نے جلد بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

میجر شمس صاحب کے حالات و تعلقات لکھئے جلد۔

۱۲/۲ اک الک اسکول   امین

(۸)

کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ ۷، ۱۹۵ء کراچی(۱)

جناب من تسلیم مورخہ ۲۸ جنوری کا عنایت نامہ موصول ہوا، میں پہلے لکھ چکا ہوں
کہ میری کوئی تصویر میرے پاس نہیں پیر حسام الدین راشدی عامل کالونی جمشید روڈ کراچی
نے ایک دفعہ فوٹو لے لیا تھا۔ میں اس سخت موسم میں دو دفعہ وہاں گیا لیکن ملاقات ہی نہ
ہوئی آپ ان کو لکھئے مجھ میں بار بار جانے اور موٹر رکشا کی کرایوں کی سکت نہیں۔

نایاب کتابوں کی رقم جو دو دہائی کے کم و بیش ہے آپ کو فکر میں ڈالے ہوئے ہے اور
آپ کے بھروسہ پر میں دوسروں کے سامنے شرمندہ ہوا تو خود خال اقبال والا معاملہ تو بیکر دوں
کا ہے اس کے متعلق کیا خیال کروں مجھے مواقع ہیں کہ اچھے شرائط پر معاملہ کروں مگر آپ کے
اصرار پر ملتوی رکھا ہے اور اب ڈر ہے کہ یہ التوا بھی باعث نقصان ہو۔

میجر صاحب سے خاص کام نہیں۔

مجھے گھر سے بس اسٹاپ تک جانا بھی اور بس میں تھوڑی دور کا سفر بھی تکلیف دہ

نامہ بہاولپور چہ رسم "خدا مبارک وقت لائے" دعا میری قائم مقام ہوگی۔

محمد امین زبیری

---

(۱) میں نے اپنی تقریب شادی میں بلانے کی حماقت کر ڈالی تھی، مرحوم نے اپنے پانچویں خط سے
اپنی تصانیف کی مطبوعہ فہرست بھی منسلک کردی تھی اور اپنے قلم سے نمبر ۱، ۲، ۴ پر x کا نشان بنادیا نمبر ۳
کے سامنے قیمت عکس ۵ یعنی پانچ روپے اور نمبر ۷، ۸ کی قیمت لکھنے کا انداز یہ ہے ۔/۸-۰۰-۰۰۰-۵
وہ دو روپے آٹھ آنے پائیوں کا تھا، اب تو سو پیسوں کا روپیہ ہے (انیس یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء محمد آباد)

(۹)

کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ ؟)

مکرم

خدا کرے آپ زندہ بصحت و عافیت ہوں، آپ کے خطوط کی تلاش ہے تاکہ مصنف و مؤلف اپنی تصویریں بھی تیار رکھے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بلند بانگ خطوط محض..... تھے، بہرحال آپ سے اخلاقاً پوچھنا ضرور تھا۔

امین

۱۲/۳ اک اک اسکول کراچی

(۱۰)

(کارڈ، مہر ڈاک خانہ کلفٹن ۷ر اپریل ۱۹۵۷ء

جناب من تسلیم۔ اتنے اشتیاق آمیز خطوط کے بعد یہ خاموشی میری سمجھ سے باہر ہے یا تو آپ میرے ساتھ مذاق کر رہے تھے اور اپنے پندار میں بنا رہے تھے یا کوئی اس پردہ میں آپ کے ذریعہ مسودہ حاصل کرنے کی تاک میں تھا۔

بہرحال اب میں آپ کے نام ایک کھلا خط اخبارات میں شائع کروں گا تاکہ دوسروں کو عبرت اور سبق ہو، آپ کے خطوط محفوظ ہیں۔

قانونی طور پر بھی آپ کی ذمہ داری کم نہیں مگر پہلے آپ کے والد صاحب کو ایک دوست کے ذریعہ مطلع کروں گا۔

امین زبیری

۱۲/۳ اِک اِک اسکول کراچی

کتاب کہانی

(ناشر کی زبانی)

پیش نظر کتاب بھی " کل امر مرھون بوقتہ " کا ایک ثبوت ہے کہ جب مصنف مرحوم تین برس تک (۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء) اس کی اشاعت کے لئے ہر ممکن کوشش میں ناکام رہ کر داغِ حسرت ہی لئے ہوئے چل بسے تو ان کی وہ آرزو اب پوری ہو رہی ہے، مگر اب بھی یہ کوئی تعجب خیز واقعہ نہیں ہے کیونکہ یہ قلمی کاوش تو محض اسی برس (۱۳۷۵ تا ۱۴۰۶ھ) بعد ہی منظر عام پر آ رہی ہے جب کہ اب تو صدیوں پہلے کے مدفون و مستور مخطوطات بھی محققین نے کھوج نکال کر پیش کر دیئے ہیں۔ اور کئے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس کی اشاعت تو مدبر الامور کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔

کیونکہ عالم امر کے ہر فیصلہ کے عالم خلق میں ظہور کیلئے، علم الٰہی میں مقررہ وقت کے ساتھ ہی ایک متعین سلسلۂ اسباب بھی ہوتا ہے لہٰذا اس کتاب کی اشاعت کیلئے تدبیر الٰہی کا آغاز یوں ہوا کہ جب ۲۱٫۹٫۸۰ء کو مجھے انیس شاہ جیلانی کا ارسال کردہ "نوازش نامے" کا نسخہ ملا تو اس میں زبیری صاحب مرحوم کے مکاتیب کے مطالعہ سے متاثر ہو کر ۲۵٫۹٫۸۰ء کو انہیں "خدوخال اقبال" کے اس مسودہ کا کھوج لگانے کیلئے لکھا جسے وہ بوجوہ مرحوم سے حاصل نہیں کر سکے تھے۔ حجایاً جیلانی صاحب نے ۲۹٫۹٫۸۰ء کو مطلع کیا کہ "خدوخال اقبال" (امین زبیری مرحوم .... محمد حسین کے تصرف میں ہے

اس خط کے جواب میں ۲۲٫۱۰٫۸۰ء کو میں نے لکھا کہ ایوب قادری صاحب

سے معلوم ہوا کہ محمد حسین صاحب کئی برس سے مفلوج اسپتال میں پڑے ہیں اور یہ
بھی انہوں نے بتایا کہ "خدوخال اقبال" کا مسودہ بابائے اردو نے لے لیا تھا اور ان
سے کوئی اقبال پرست لے گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ۲۸ر۱۰ر۸۰ء کو لکھا کہ
"ایوب قادری صاحب کی اطلاعات غلط ہیں، مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد وہ
نسخہ محمد حسین صاحب ہی کی تحویل میں تھا اور ان کا اصرار تھا کہ اسے چھپنا نہیں چاہیے"
غالباً آپ کا خط آیا تو میں اسی دن ایک اور ضرورت سے "مکاتیب عبدالحق مرتبہ
جلیل قدوائی" دیکھ رہا تھا۔ اس کے صفحہ ۵۵۹ پر محمد حسین کے نام دو خط ہیں۔ دونوں
میں خدوخال اقبال" کا ذکر ہے۔ جلیل قدوائی صاحب کا حاشیہ یہ ہے کہ مسودہ
محمد حسین خاں کے پاس محفوظ ہے۔

دریں اثناء میں نے اس مسودہ کی جستجو دیگر ذرائع سے بھی شروع کر دی تھی۔
چنانچہ ۲۲۔۱۱ر۸۰ء کو ایک عریضہ محترمی الحاج محمد زبیر زبیری صاحب (سابق اسسٹنٹ
لائبریرین محمد حسین آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی خدمت میں بھی ارسال کرکے
ان سے درخواست کی کہ وہ مسودہ محمد حسین صاحب سے حاصل کرنے میں مدد فرمائیں
جس کا جواب ۳۰۔۱۱ر۸۰ء کو انہوں نے یہ دیا کہ "محمد امین زبیری میرے بہت قریبی
عزیز تھے۔ مارہرہ میں ان کی ماں میرے گھر کے پاس رہتی تھیں۔ وہ اپنی ذاتی محنت
اور کوشش سے بہترین مصنف و مؤلف بن گئے بڑے پایہ کی کتابیں لکھیں۔ کراچی
میں محمد حسین انکے بہت کام آئے اور انکی پریشانیوں میں انکے بڑے مددگار بنے رہے چنانچہ وہ
اپنا علمی سرمایہ یعنی کتابیں اور مسودے وغیرہ ان کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹر اقبال کے متعلق
جو انہوں نے بلند پایہ کتاب لکھی تھی وہ ہم پاکستانیوں کی تنگ نظری کے باعث نہ
چھپ سکی۔ اور اس کی اشاعت کی آرزو لے کر وہ رحلت کر گئے۔

زبیری صاحب کے اس خط سے منقولہ بالا اقتباس میں نے ۳ر۱۲ر۸۰ء کو
جب جیلانی صاحب کو لکھ بھیجا تو انہوں نے جواباً ۱۱-۱۲-۸۰ء کو لکھا کہ "آپ

کے یہی لیل و نہار رہے تو "خد و خال اقبال" کا مسودہ کسی نہ کسی دن آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔ (محمد حسین) تو اب گئے کام سے لیکن یہ بزرگ .... کچھ نہ کچھ کر ہی گزریں گے۔ آپ ان کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ مولوی عبد الحق کے دو خطوط محمد حسین کے نام ہیں پہلا ۲۵ ستمبر ۱۹۵۸ء کا، دوسرا ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کا مولوی عبد الحق نے پہلا خط زبیری مرحوم کے انتقال پر لکھا ہے اس میں مسودے کا ذکر ہے کہ اردو اکیڈمی سندھ والے شائع کرنا چاہتے ہیں دوسرے میں لکھا ہے کہ "مسودہ آگیا ہے کسی وقت آکر لے جائیے۔ مسودہ غالباً اردو اکیڈمی سندھ کے خالد صاحب کے ہاں سے واپس آیا ہو گا۔

جمیل زبیری صاحب سے بھی محمد امین زبیری مرحوم نے اپنے انتقال سے کچھ روز قبل ایک مرتبہ خود اس مسودے کا ذکر کیا تھا پھر جمیل زبیری، عمران صاحب اور میری گفتگو میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ ۲۶ برس کی پیلے کاغذ پر کتابت سے اب طباعت ممکن ہو سکے گی یا نہیں۔ چنانچہ جون ۱۹۸۵ء میں جب جدہ سے عمران صاحب کے پاس سے آئی تو جمیل زبیری صاحب اور مجھے بھی متفقہ فیصلہ کرنا پڑا کہ یہ ۲۶ سال پرانی پیلے کاغذ پر کتابت ناکارہ ہے لہٰذا از سر نو بٹر پیپر پر کتابت کرانی پڑے گی چنانچہ کتابت کا انتظام کیا گیا جو اب پیش نظر ہے۔

محمد امین زبیری مرحوم کو میں نے کبھی دیکھا نہ کبھی ان سے غائبانہ تعلق بذریعہ مراسلت و مکاتیب ہی رہا تو پھر فطرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر چھ برس تک ان کی اس قلمی کاوش کی جستجو میں کیوں سرگرداں رہا؟ یہ بھی نہیں کہ میں اقبال کے خواہ مخواہ مخالفوں میں ہوں لہٰذا یہ ساری تگ و دو حب علیؓ کی بناء پر نہیں بلکہ بغض معاویہؓ کی وجہ سے ہو، پھر یہ بھی کہ اس کتاب کے شمولات سے جو اجمالی تعارف "نوازش نامے" میں مرحوم کے مکاتیب سے ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی تھا کہ اسی اجمال کی تفصیل اس کتاب میں ہو گی جیسا کہ مطالعہ کے بعد واضح بھی ہوا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی کھلی کہ مصنف کا اصل مقصد علامہ کی تنقیص نہیں بلکہ جیسا کہ انہوں

نے جیلانی صاحب کو اپنے خطوط میں نیز اپنی اس تصنیف میں لکھا ہے، یہ محض ان مخصوص مجاوران اقبال کی "ممی پرانند" کی تردید ہے جو اقبالؒ کی قبر پر چڑھ کر اپنے قد کی بلندی کے مدعی ہیں اور محض اپنی مجاورت کی اہمیت و عظمت کے اظہار کے لئے اسے ہر قولی و فعلی و علمی و فکری بشری خامی سے معصوم "تیرھواں امام" ثابت کرنے کے لئے اپنی ساری علمی و ادبی، ذہنی و قلمی صلاحیتیں صرف کئے جا رہے ہیں۔ یہ بزعم خویش ماہرین اقبالیات اس مجاورانہ گر کو خوب سمجھتے ہیں کہ کسی چھوٹے موٹے پیر کے مزار کے جاروب کشوں کی وہ توقیر نہیں ہوتی جو کسی بڑی درگاہ کے مجاوروں کی ہوتی ہے اور پھر کیونکہ اقبال کو ایوانہائے حکومت میں بھی کرشمۂ قدرت سے ایک مقام رفیع حاصل ہے لہٰذا اس کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی سے (چاہے کیسی ہی مضحک ہو) مادی منفعت اندوزی بھی کی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی نام نہاد اقبال شناسوں لیکن دراصل اقبال فروشوں کے خلاف زبیری مرحوم نے قلم اٹھایا تھا اور دستاویزی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ علامہ اپنے عہد اور ایک جہت خاص میں نابغہ بے شک تھے مگر دیگر جہات آدمیت میں ان کمزوریوں سے مبرا و منزہ نہیں تھے جو بشریت کے لوازمات ہیں۔

اگر یہ کتاب تصنیف کے معاً بعد ۱۹۵۶/۱۹۵۵ء میں شائع ہوتی تو اس میں جو حقائق ہیں ان میں سے کچھ ضرور چونکا دینے والے ہوتے مگر تب سے اب تک ۳۰/۳۱ برس میں علامہ کی ظاہری و باطنی شخصیت کی ہر جہت پر دونوں ملکوں کے محققین نے اتنا کچھ مواد فراہم کر دیا ہے کہ اب اس کتاب میں ایسی بات نظر نہیں آئے گی جو پہلے ہی کوئی نہ کوئی صراحتہً یا کنایتہً نہ لکھ چکا ہو۔ تقریباً ایک ثلث صدی تک اسے غیبت صغریٰ میں روپوش رکھنے میں مشیت ایزدی یہی تھی کہ امین زبیری مرحوم کو پہلا پتھر پھینکنے والا نہ کہا جا سکے۔

ایک تہائی صدی تک پردۂ غیب میں کالعدم رہنے والی اس قلمی کاوش کو اب منصۂ شہود پر لانا دراصل میرا کوئی کارنامہ نہیں ہے بلکہ مجھے تو مسبب الاسباب

نے مرحوم کی آخری آرزو کی تکمیل کے لئے محض ایک سبب بنا ڈالا جو کسی اور کو بھی بنا سکتا تھا کیونکہ سنت الہٰی یہی ہے کہ اس عالم اسباب میں کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کے ظہور کے لئے بھی اسباب کا ایک سلسلہ پیدا کر دیا جاتا ہے خواہ کوئی سمجھ سے یا نہ سمجھ سکے۔ جیلانی صاحب، زبیر صاحب، قدوائی صاحب، عمران صاحب، جمیل زبیری صاحب اور میں، ہم سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن کے وقت مقررہ پر جڑنے کے بعد ہی یہ نتیجہ ظاہر ہونا مقدر تھا جو اس کتاب کی صورت میں پیش نظر ہے۔

علامہ کو آدمیت سے خارج کر کے دیوتاؤں کے سنگھاسن پر براجمان دکھانے میں جن ذی اقبال دانشوروں کا ذاتی مفاد ہے ان کا ذہنی ردعمل اس آئینہ کو دیکھنے سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن ان کے طلسم خانہ سے آزاد وہ اہل فکر و شعور قارئین جن کے دل و دماغ مسحور نہیں ہیں ان سے البتہ امید ہے کہ زبیری مرحوم کی اس حقائق کشا تحریر کا غیر متعصبانہ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اسے علامہ کے صحیح مقام بشریت کو سمجھنے میں معاون پائیں گے۔۔

باب ۱

نقوشِ سیرت

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری میں ان پیغامات کا بڑا حصہ ہے جن کو الہامی اور پیغمبرانہ شان کا جلوہ کہا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے یہ تذرپیش کی گئی کہ ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اس نذر کو دیکھنے کے بعد قدرتی طور پر اس بات کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ خود شاعر کی ذات میں یہ جلوہ کتنا نمایاں ہے اور روزمرّہ کی زندگی اور خاص و عام تعلقات میں اس کی کیا ضیا باریاں ہیں اور اسلامی رُوح کتنی قوت رکھتی ہے اور اس کی روح میں بھی یہ رُوح موجود ہے؟

"نجی معاملات اور شخصی زندگی کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ دنیا میں کون انسان ہے جو کبھی نہ کبھی اپنے کمزور لمحوں میں ایسی حرکتوں کا مرتکب نہیں

ہو جسے دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ نجی حالات کو بے نقاب کرنے میں بڑی احتیاط و ذوقِ سلیم اور خدا ترسی کی ضرورت ہے۔ عام طور پر ستر عیوب ہی قومی فلاح اور ذوقِ پسندیدہ کا راستہ ہے۔ لیکن ایک شخص کی تعلیمات اور شخصی زندگی کو بالکل جدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ ایک شخص قومی رہنمائی کا ادعا کرتا ہے تو اس کے نجی معاملات بھی قوم کی املاک ہو جاتے ہیں اس کی شخصی زندگی ایک عقبی سرزمین ہوتی ہے، اس کے خیالات و افکار کے لئے اور اسے جانے بغیر اس کی تعلیمات کا کامل اندازہ لگانا اور اس کی صحیح قدر و قیمت پہچاننا امر محال ہے۔" (موج کوثر ص۲۲۷۔ شیخ محمد اکرام)

علامہ کی متعدد سوانح عمریاں بھی شائع ہوئی ہیں۔ مگر سوانح عمری کا معیار یہ ہے کہ:

"وہی سوانح عمری سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحب سوانح کی شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیل درج ہو اور ان تمام جزئیات کا تذکرہ کیا جائے جن کو پڑھ کر اس شخصیت کا بولتا چالتا تصور پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے۔" (ذکر اقبال ص۱۔ سالک)

مگر "یہ ضرورت زیادہ تر ان اصحاب کی روایات و بیانات سے پوری ہوتی ہے جو اس کے ہم نشین ہوں یا اس سے قریبی توسل رکھتے ہوں مگر ان میں مبالغہ۔ تصنع۔ اور حق و باطل کی آمیزش کا بھی احتمال ہے۔ اس لئے بہترین ذریعہ وہ دستاویزات ہیں جن سے حقائق و واقعات کو اخذ کیا جاتا ہے اور اس میں بھی سب سے زیادہ قابل استناد وہ خطوط ہیں، جو خود اس شخص نے لکھے ہیں جس کی سیرت کا ہم اندازہ و

اِدراک کرنا چاہتے ہیں (تقریر یوم اقبال ۱۹۵۵ء)

"صرف ایک ہی شئے انسان کی حقیقی شکل وصورت کا آئینہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے۔ چونکہ لکھنے والے کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظرِعام پر آئیں گے۔ پھر بہت سے مکتوب الیہ ایسے ہوتے ہیں جو اس کے محرمِ اسرار اور عزیز دوست ہوتے ہیں جن سے کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس و پیش حوالۂ قلم کرتا جاتا ہے۔ اس لئے اس آئینہ میں انسان ایسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ درحقیقت وہ ہے۔ انسان کی بڑی سے بڑی لائف اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصا کا خاص اہتمام کیا جائے، تاہم سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑنے پڑیں گے۔ بیچ بیچ میں ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی میں مخفی رہ جاتے ہیں لیکن اکابر رجال اور خصوصاً اہلِ قلم اور مصنفین کے بہت کم دن ایسے گزرے ہیں کہ ان کو خود خط لکھنا اور دوسروں کے خطوط کا جواب دینا نہ پڑتا ہو۔ اس لئے اس مسالہ سے اگر ان کی سوانح نگاری کا فرض ادا کیا جائے تو اُن کی زندگی کے روزنامچہ کا کوئی خانہ خالی نہ رہ سکے گا" (سید سلیمان ندوی، مقدمہ مکاتیب شبلی)

"خانگی خطوں میں اور خاص کر جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں ہوتا گویا انسان خود اپنے

سے باتیں کرتا ہے جہاں اندیشہ لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے" پھر کون ہے جو اس خاموش آواز سننے کا مشتاق نہ ہوگا یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں اور آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں ان میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کام میں نظر نہیں آتا یہاں انسان بچپن کی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اُس کے دل ودماغ میں گزرتے ہیں جنھیں نہ انشاء کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہوں واستعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے" (مولوی عبدالحق مقدمہ خطوط شبلی)

مگر علامہ اقبال کے سوانح نگاروں نے ان کے خطوط ومکاتیب کو جو تعداد میں بہت زیادہ اور مختلف مذاق وفکر اور درجات رکھنے والوں کے نام ہیں بہت کم پیش نظر رکھا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عمداً اعراض بھی کیا گیا ہے ساتھ ہی واقعات وروایات کی تحقیق وتنقید نظر انداز کی ہے اور پھر اُن کے بیانات میں زیادہ تر اپنی ادبی قابلیت کے مظاہرات نظر آتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بعض واقعات کی تردید خود علامہ ہی کی تصانیف وخطوط میں ملتی ہے۔

اب ہم خطوط[1] کی روشنی میں اور تحقیق ودرایت سے کام لیکر سیرت

---

[1] شاد اقبال مرتبہ ڈاکٹر زور حیدر آباد دکن (۲) اقبال نامہ مجموعہ خطوط مرتبہ شیخ عطاء اللہ لاہور (۳) ملفوظات اقبال مرتبہ بزم اقبال (۴) ذکر اقبال مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک (۵) سیرت اقبال مرتبہ محمد طاہر فاروقی (۶) اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں (۷) اقبال کی کہانی مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین احمد

اقبال کے نقوش پیش کریں گے۔ لیکن اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اِن خطوط میں بھی کتر بیونت کی گئی ہے اور طباعت و اشاعت کے بعد متعدد صفحات تبدیل و خارج کئے گئے ہیں۔

اقبال کی سوانح عمریوں اور اقبال کے متعلق مقالوں کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے کہ اِن میں سر سیّد اور علی گڑھ تحریک کی تحقیر و مذمّت پائی جاتی ہے اور اس مذمّت کے لئے مسخِ واقعات وغیرہ کو بھی جائز رکھا گیا ہے اور زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ بعض کتابیں جو مستند اداروں "بزم اقبال لاہور" اور اقبال اکادمی کراچی کے اہتمام سے شائع ہوئی ہیں ان میں بہت زیادہ یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اِن اداروں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اس لئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت کا ایما نہ سہی اس کی پسندیدگی شامل ہو گی۔ ہم نے آخر میں ذکرِ اقبال شائع کردہ بزمِ اقبال اور اقبالیات کا تنقیدی جائزہ شائع کردہ اقبال اکادمی کی تمہیدوں کا جو پہلی اقبال کے اُستاد محترم کے بیان میں ہے اور دوسری آغاز کتاب میں ہے اقتباس کر کے اس پر بھی تبصرہ پیش کیا ہے۔

ابتدائی حالات | علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔

ان کے والد ماجد شیخ نور محمد نہایت وجیہہ، ذی عقل اور سنجیدہ مزاج تھے۔ اُن کی شادی جس خاتون سے ہوئی اُن کا نام امام بی بی تھا۔ اگرچہ علم سے بہرہ نہ پایا تھا لیکن نہایت دانشمند اور اپنے محلّہ و برادری میں بے حد محترم اور ہر دلعزیز تھیں۔

خود شیخ نور محمد بھی پڑھے لکھے نہ تھے لیکن چونکہ ابتدا سے ہی علما و

صلحا کی صحبت میں رہے اور غور و فکر کی عادت کے علاوہ تصوف میں درخورِ وافی رکھتے تھے اس لئے بعض ہم عصر اکابرِ علم اُن کے متعلق کہا کرتے تھے کہ شیخ نور محمد ان پڑھ فلسفی ہیں۔ بعض لوگ تصوف کی کتابیں پڑھ کر اُن کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے۔ شیخ صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے۔" (ذکر اقبال ص۷)

سیالکوٹ میں ایک ڈپٹی وزیر علی نے اُن کو اپنے ہاں پارچہ دوزی پر ملازم رکھا تھا لیکن علامہ کی والدہ اُن کی تنخواہ میں سے ایک حبہ نہیں لیتی تھیں کیونکہ اُن کے نزدیک ڈپٹی کی آمدنی کا غالب حصہ شرعاً ناجائز تھا۔

"پھر شیخ نور محمد یہ ملازمت چھوڑ کر ٹوپیاں سینے لگے جو بعد مقبول ہوئیں اور دوسرے کئی خیاط نوکر رکھنے پڑے۔ اُن کے دو لڑکے شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال تھے، عطا محمد نے معمولی تعلیم پائی تھی لیکن رڑکی انجینئرنگ اسکول کا امتحان پاس کر کے ایم۔ ای۔ ایس میں اوورسیئر ہو گئے کافی روپیہ کمایا۔ علامہ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی یورپ بھیجا۔ علامہ بھی اپنے بڑے بھائی کے فریفتہ[۱] تھے۔" (ذکر اقبال ص۸-۹)

شیخ نور محمد کو صاحبِ کرامت و کشف بھی کہا گیا ہے۔ علامہ کی ولادت سے قبل انھوں نے حسبِ بیان خود ایک خواب بھی دیکھا کہ

---

[۱] اس خدمت میں کافی روپیہ کمایا جا سکتا ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، تعجب ہے کہ والدہ نہایت متقی تھیں لیکن فرزند پر کوئی اثر نہ تھا اور یہی روپیہ علامہ کی تعلیم پر صرف ہوا۔ فکر اقبال میں بھی یہ بیان موجود ہے، مزید براں والدہ کی نسبت تحریر ہے کہ علامہ اقبال نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ والدہ مرحومہ کا بیان ہے کہ اندھیری رات تھی کمرہ میں بھی چراغ روشن نہیں تھا آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمرہ تمام روشن ہے حالانکہ نہ باہر چاندنی اور نہ چراغ تھا۔

ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے اس کی دلکشی و دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا کر اس پرندہ کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم اُترا اور میری گود میں آن گرا۔ آپ نے اس کی تعبیر خود ہی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو گا جو خدمت اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔" (ذکر اقبال ص)

"اس میں شک نہیں کہ اقبال کے دماغ کی پرورش تو طویل سلسلۂ تعلیم میں ہوتی رہی۔ لیکن غذائے روح ان کو شروع ہی سے جسمانی رزق کے ساتھ باپ سے ملتی رہی۔" (ذکر اقبال ص۱۵)

"علامہ کو بچپن ہی سے بٹیریں پالنے اور کبوتر بازی اور اکھاڑہ کی ورزش کا شوق تھا پھر اس میں غزل گوئی کا شوق بھی شامل ہو گیا اور مقامی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔" (ذکر اقبال صفحہ ۱۵-۱۶)

تعلیم ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر سیالکوٹ کے مشن کالج اور ازاں بعد لاہور میں ثانوی و اعلیٰ تعلیم ہوئی۔ سیالکوٹ میں اپنے زمانے کے ایک فاضل اجل مولانا میر حسن پروفیسر علوم مشرقی سے بطور خاص فارسی و عربی کی بھی تعلیم پائی۔ ایم اے کے بعد مغربی تعلیم کے لئے یورپ گئے۔ وہاں کی تعلیم اور دیگر تعلیمی حالات و علمی خدمات کا بیان علامہ کے ہی ایک خط سے لینا مناسب ہے جو ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ سر کشن پرشاد کو لکھا تھا۔

"مخبر دکن سے معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کی ججی کے لئے

چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ، کے سامنے پیش کئے گئے ہیں جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری ہیں جن کا علم ممکن ہے کہ سرکار عالی کو نہ ہو۔ ممکن ہے کہ ان امور سے متعلق حضور نظام سرکار سے استفسار فرمائیں اس جگہ کیلئے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں ہے تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں میں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمبرج) جرمنی (میونک) یونیورسٹیوں کے پاس کئے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھے فلسفہ کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا اور یہاں کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی گورنمنٹ نے بعد ازاں مجھے یہ جگہ آفر بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ ججان ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصہ میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ مگر اس عہدہ کے لئے جو حیدرآباد میں خالی ہوا ہے غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہوگی اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش گزار کرنا ضروری ہے کہ

عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اوّل رہا ہوں۔
انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی
کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الہ آباد
کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی اے اور ایم اے
کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ اب کے الہ آباد یونیورسٹی
کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی اے
کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم اے فلسفہ کے دو پرچے میرے
پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ
کالج میں علم اقتصاد۔ تاریخ اور انگریزی بی اے اور ایم اے
کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکام بالا دست سے تحسین
حاصل کی ہے۔
تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصہ سے جاری ہے۔
علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے
لکھی۔ انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل
رسالہ فلسفہ ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا
تھا باقی جو کچھ میرے حالات ہیں وہ سرکار پر بخوبی روشن ہیں۔
اُن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقہ اسلام میں
اس وقت ایک مفصل کتاب بزبان انگریزی زیر تصنیف ہے
جس کے لئے میں نے مصر و شام اور عرب سے مسالہ جمع کیا ہے
جو انشاء اللہ بشرطِ زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے
فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب

کو تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بنا دوں جیسا کہ امام نسفی کی مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی۔"

ؔ (۱) علامہ ۱۹۱۱ء میں حیدر آباد کی ملازمت کے خیال سے بھی بیزار تھے۔ چنانچہ عطیہ بیگم کو لکھ کر حیدر آباد میں ملازمت کا سوال تو میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(۲) علامہ کی مذہبی تعلیم معمولی تھی مولانا میر حسن سے عربی و فارسی زبان دانی حاصل کی تھی۔ علامہ خود معترف ہیں کہ "میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزری ہے اور مغربی نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے دانستہ یا نا دانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔ (خط بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

(۳) مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ :- "اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)"

(۴) اب دوسری کتاب کو دیکھیے جس کا مفصل بیان آئندہ اوراق میں سر سید (راس مسعود) کے نام کے خطوں میں ہے اور جس کے لئے پانسو روپے ماہوار مقرر ہوا۔ "عہد حاضرہ کے افکار کی روشنی میں قرآن کریم پر نوٹ"؛ اس کتاب کے لکھنے کی بے تابی کا اندازہ اس مراسلت سے ہوتا ہے۔ اسکی نسبت سے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ "انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کر دوں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے (خط ۷ اگست ۱۹۳۷ء) مگر یہ کتابیں صرف خانۂ تصور میں رہ گئیں۔ وظیفہ مئی ۱۹۳۵ء میں مقرر ہوا اور انتقال ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ بالفاظ دیگر تین سال وظیفہ حاصل کرتے رہے۔

قانونی پریکٹس

سوانح نگار کا بیان ہے کہ یونیورسٹی سے استعفیٰ کے بعد اپنی توجہ قانونی پریکٹس پر مبذول کی لیکن اس پیشہ میں اُن کو شہرت و کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فکر روزی سے پریشان ہی رہے۔ بیرسٹری کے بہترین زمانے میں بھی اُن کی آمدنی کبھی ایک ہزار سے تجاوز نہ ہوئی (آثار اقبال ص ۲۵)

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ:-

"زر اندوزی کی ہوس نہیں تھی بس اپنے اخراجات پورے کرنے کی حد تک ہی پریکٹس کرتے تھے۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرماتے لگے کہ کوئی آٹھ سو روپیہ ماہوار تک وکالت کا کام لیتا ہوں" (رسالہ نقوش)

سیاسی کارنامہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ:-

"یہ بات نہ تھی کہ اقبال کی مہارت قانونی میں کسی کو شک تھا بنچ اور بار دونوں کو ان کی قانون دانی کا اعتراف تھا، ایک سے زاید مرتبہ لاہور کی ججی کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا تھا لیکن بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ آمدنی کے نقطہ نظر سے وہ اپنے زمانے کے کامیاب وکلاء میں شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ اور ان کی آمدنی بس یوں ہی سی تھی اس کی اصل وجہ بھی اقبال کی آزادی طبع تھی ہمیشہ وکالت میں کامیابی کا راز قانون سے زیادہ جج کو سمجھنے میں مضمر ہے۔ ایک کامیاب وکیل پہلے جج کو رام کرتا اور قانون کی اپنے موافق تعبیر و توجیہہ کرتا ہے اور اس کے لئے اس کو وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کو عام طور پر ذرا شریفانہ انداز میں دنیا سازی کہا جاتا ہے۔ تملّق و چاپلوسی بھی کرنی پڑتی ہے ڈنر اور عصرانے بھی دینے پڑتے ہیں پھر اگر حاکم عدالت واقعی حاکم وقت

بھی ہو حاکم وقت قوم کا فرد بھی ہو تو نوبت تملق و چاپلوسی ڈنر اور عصرانہ سے گزر کر محفل اکل و شرب نائٹ کلب اور ناچ گھر تک پہنچ جاتی ہے اقبال کے زمانے میں بھی کامیاب وکالت کی یہی ترکیبیں تھیں لیکن انھیں اس سے کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ نفرت سی تھی۔

الغرض پیشۂ وکالت میں ان کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی انگریز کی غلامی اور خوشامد سے نفرت تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی پوری عمر معاشی سکون اور آسودہ حالی سے ناآشنا رہی"۔ (صـ۱۹ ۳۲۰-۳)

"سیاسی کارنامہ" میں افسوس ہے کہ اقبال کی ناکامی کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں وہ ایک عام حملہ ججوں اور وکیلوں پر ہے۔ کامیاب وکلاء کی فہرست میں بہت ایسی ہستیاں نظر آئیں گی جن میں اقبال سے زیادہ آزادی اور خودداری کا جوہر تھا دور جانے کی ضرورت نہیں صرف پنجاب کے اندر اقبال کے تین چار معاصر وکلا ہی کو دیکھا جائے مثلاً سر فضل حسین، سر شفیع، شاہ دین، سر عبدالقادر، کیا انھوں نے اِن ہی ترکیبوں سے کامیابی حاصل کی جن سے اقبال کو تنفر تھا؟

ہائی کورٹ کی ججی صرف ممتاز و کامیاب اصحاب کو پیش کی جاتی ہے اور اقبال کو قانون میں کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی ہند کے ہائی کورٹوں کے علاوہ حیدرآباد دکن میں بھی باوجود سر کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کی دوستی کے وہ یہ عہدہ حاصل نہ کر سکے۔ پھر اگر یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ وہ قابل نفرت ترکیبیں گوارا نہ کرتے تھے تو چیمبر پریکٹس میں تو یہ تراکیب نہیں ہوتیں۔ اس طرح وہ اپنا قانونی جوہر نمایاں کر سکتے تھے۔ بہر حال ان کو فکر معیشت سے شاذ ہی نجات ملی۔

پروفیسری سے مستعفی ہونے کے بعد آمدنی کی ایک مستقل مد جاتی رہی۔ البتہ قانونی پریکٹس اعزازی لکچروں اور امتحانوں کی فیس تصنیف وتالیف ذرائع معاش رہے جو غیر مکتفی تھے اور اسی وجہ سے ہمیشہ الجھنوں میں گرفتار رہا کرتے تھے۔

متاہل زندگی

"ذکر اقبال" کے مصنف کا بیان ہے کہ علامہ ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اُنکے والد ماجد نے جب کہ وہ عمر کی بیسویں منزل میں تھے شادی کردی۔ دولھن ایک دولتمند بزرگ کی لڑکی تھیں۔ اقبال کی یہ شادی ناکام ہوئی اگرچہ انھوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے لیکن زوجین میں میل کا امکان کم ہوتا گیا اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔"

(ص ۱۵)

"چونکہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی مطمئن نہ تھے اور موافقت ومصالحت کی کوششیں ناکام ہوچکی تھیں اس لیے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہشمند تھے چنانچہ ایک کشمیری خاندان میں نکاح ہوا۔ ہنوز رخصت نہ ہوئی تھی کہ بعض گمنام خطوط سے علامہ مشتبہ ہوگئے اور اس کو معلق چھوڑکر لدھیانہ کے ایک متمول خاندان میں تیسری شادی کی۔ لیکن جب تفتیش حالات سے ثابت ہوا کہ یہ گمنام خطوط ایک شریر و بدباطن آدمی کا کام تھا تو علامہ اب اُن کو لانے کے لئے آمادہ ہوئے، اور تجدید نکاح کرکے لے آئے۔ اس خاتون سے جو جاوید وغیرہ کی والدہ ہیں شادی ہوجانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی

عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اقبال کی زندگی کا اسلوب کاملاً بدل گیا۔" (ذکرِ اقبال ص)

خطوط بنام عطیہ بیگم اِن حالات کے مطالعہ کے بعد اِن خطوں کو پڑھنا زیادہ دلچسپ ہوگا۔ جو اقبال نے عطیہ بیگم کو لکھے۔ مگر یہ سلسلہ مراسلات ۱۹۱۱ء کے بعد کم ہوگیا اور اب جو خطوط لکھے[2] وہ بقول عطیہ بیگم کسی کو دکھانے کے قابل نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت تک بیگم موصوفہ ناکتخدا تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں اُن کی شادی ہوئی۔ عطیہ بیگم کو اتنی بیزاری ہوگئی تھی کہ ۱۹۱۰ء میں لاہور گئیں تو اقبال کو نہ روانگی کی اطلاع دی اور نہ لاہور پہنچکر ان سے ملنے کو گئیں جس کی اقبال نے ایک خط میں شکایت بھی کی ہے۔ (مکاتیب اقبال)

چند اقتباسات میں قید ملازمت سے آزاد رہنا چاہتا ہوں اور دوسرے میرا ارادہ اولین فرصت میں اس ملک سے ہجرت کرنیکا ہے وجہ آپ کو معلوم ہے ....[3] میری زندگی حد درجہ تلخ ہے اس معصیت کا واحد علاج یہی ہے کہ میں اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جاؤں

---

[1] مجموعہ مکاتیب میں وسؔ مکتوب ہیں جن کا سلسلہ ۱۹۰۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ دونوں بغرض تعلیم یورپ میں تھے۔ اور اسی دوران میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور علمی مذاق کی یکسانی سے دوستانہ راہ و رسم پیدا ہوئی۔

[2] راقم کے استفسار پر یہ جواب تحریری دیا۔

[3] نقاط کے بعد حرف مرتب نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ یہاں اقبال نے ایک خانگی اور نی پریشانی کا ذکر کیا ہے۔

یا پھر شراب نوشی کی لت ڈالوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے کتابوں کے بوسیدہ وعظیم اوراق میرے لئے سرمایہ مسرت سے عاری ہیں۔ میری روح کا سوز انھیں اور تمام سماجی رسم ورواج کو جلا کر خاک کر دینے کے لئے کافی ہے۔

آپ کہتی ہیں کہ دنیا کو ایک خدائے خیر نے پیدا کیا ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن دنیا کے حقائق تو کسی دوسرے نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر عقل انسانی کو ہی معیار قرار دیا جائے تو یزداں کی نسبت ایک قادر مطلق اور ابدی اہرمن پر ایمان لانا زیادہ آسان نظر آتا ہے۔ ان خرافات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میں ہمدردی کا طالب نہیں میں تو اپنی رُوح کا وہ بار ہلکا کرنا چاہتا ہوں جس کے نیچے وہ دبی چلی جا رہی ہے۔ (۹ر اپریل ۱۹۰۹ء)

(۲) میرا سینہ یاس انگیز اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے یہ خیالات میری روح کی تاریک بانبیوں سے سانپ کی طرح نکلتے چلے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک سپیرا بن جاؤں گا گلیوں میں پھروں گا اور تماشں بین لوگوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے ہو گی۔

یہ خیال نہ فرمائیے کہ میں مبتلائے یاس ہو چکا ہوں یقین مانئے میری تیرہ بختی میرے لئے ایک لطیف لذّت کی سرمایہ دار ہے اور میں اُن لوگوں پر ہنستا ہوں جو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔

(۱۷ر اپریل ۱۹۰۹ء)

(۳) مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میری نیت اور میرے عمل سے متعلق ایک افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجھے امید ہے کہ میں اپنے اخلاص و صداقت کا آپ کو قائل کر سکونگا مجھے آپ کی فطری نیکی پر ایسا ہی اعتماد ہے ....

ہمارے درمیان جو غلط فہمی ہوئی ہے اس کے متعدد اسباب ہیں اور یہی اسباب غیر شعوری طور پر آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہیں۔ اِن اسباب نے میری شومیٔ قسمت سے آپ کو مجھ سے اس حد تک بدظن کر دیا ہے کہ آپ مجھ پر دروغ بافی کی تہمت تک اُتر آئی ہیں اور میرے تعلقات کو خلوص و صداقت سے مُعرّا سمجھتی ہیں .....

یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ میرے خطوط آپ سے متعلق میرے رویّہ کے غلط اندازہ کی روشنی میں مطالعہ کرتی ہیں اور یہ کوشش نہیں کرتیں کہ آپ کا خیال جس غلط راستہ پر پڑ چکا ہے اس سے ہٹا لیں اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو ازراہ کرم خلوص و دیانت کی خاطر (اور اس جنس میں میری تہی مائگی مسلّم اور آپ کا دامن مالا مال ہے) اس وقت تک انتظار کیجئے کہ حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے۔ مقتضائے انصاف یہی ہے آپ منصف مزاج ضرور ہیں خواہ بعض اوقات ضد ہی کیوں نہ کر بیٹھیں ...... مجھ میں اب شاعری کے لئے کوئی ولولہ باقی نہیں رہا ایسا محسوس کرتا ہوں کہ کسی نے میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہے اور میں محروم تخیل کر دیا گیا ہوں۔ (۷ رایپریل ۱۹۱۱ء)

(۴) گذشتہ چار پانچ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی حامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ پبلک کو انھیں پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض تو میں نے تلف کر ڈالی ہیں تاکہ کوئی انھیں چرا کر شائع نہ کر دے۔

(۷ رجولائی ۱۹۱۱ء)

ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد جن کو ترادش جگر نہیں بلکہ ترادش طبع کہنا چاہیئے۔ ہر حساس دل میں گجرات والی خاتون کی عزت و ہمدردی میں زبردست اضافہ ہوجاتا ہے۔ وہ شریف خاتون ایک دولتمند باپ کی اکیلی بیٹی تھی اور اولاد سے بھی مایوسی نہ تھی[1] کیونکر گوارا کرسکتی تھی کہ اس کا شوہر مصری کی مکھی بن جائے۔ اس لئے اسکا رنج اور اس کا اظہار ایک فطری امر اور ناقابل برداشت جذبہ تھا۔ ان خطوط سے بھی صاف مترشح ہوتا ہے کہ علامہ خود عطیہ بیگم کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے تھے اور جب انھیں اپنی کوششوں میں ناکامی اور مایوسی نظر آئی تو سلسلہ مراسلت ترک ہوگیا اور درمیانی بیوی جو کشمیری تھیں تجدید نکاح کے بعد اقبال دولہن بن گئیں اور اب اقبال چہل سالہ بھی ہوگئے تھے۔ اس لئے بمقتضائے عمر رنگ رلیاں بھی ختم ہوئیں۔

نشاطِ عمر ماند تا بہ سی سال
چو چل آمد فرو ریزد پر و بال

عیش و تنعم کے اسباب سے بیزاری

"پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور دو ایک مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں اُن کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرہ میں آرام کرنے

---

[1] اقبال عارف کی ولادت یورپ جانے سے پہلے ہو چکی تھی۔

کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقہ میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بوریئے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی اس بستر پر لیٹنا اُن کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھے اور برابر غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے میں ہی سوتے رہے۔" (فاروقی۔ سیرت اقبال صد ۸۲)

یہ واقعہ بھی قوت ایجاد کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اس سے قبل اور بعد کے زمانوں میں حیدر آباد دکن، بھوپال اور کابل کے مہمان خانوں میں مہمان رہے جو عیش و تنعم کے سامان سے آراستہ تھے مگر یہ خیال نہ آیا اور نہ پھر کبھی تازہ ہوا۔

غسل خانے میں جاکر بیٹھنا اور ایک سے زیادہ راتوں کا بسر کرنا بھی تحیّر آمیز ہے۔ ایسے غسل خانے اتنے وسیع نہیں ہوتے۔ شاور باتھ، منہ ہاتھ دھونے کے لئے ظرف۔ صابن یا پانی کے دیگر ظرف ٹب وغیرہ کموڈ یا پاٹ اور نہانے دھونے کا دوسرا سامان بھی اسی میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں غسل خانے میں سونا صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ علامہ نماز تہجد اور نماز پنجگانہ و تلاوت کے پابند تھے۔ نفیس مزاج بھی تھے اور پھر ان کا ذاتی بستر بھی بوریہ نہ تھا۔ عیش و تنعم کا سامان جو اس خیال کا محرک ہوا میزبان کی خاطر و مدارات وناشتہ، لنچ اور ڈنر وغیرہ سب

س میں ہی ہو گا۔ پھر نہ تو میزبان نے اور نہ رفقا نے اس کا خیال کیا کہ یہ
عزم مہمان و رفیق اس طرح کی راتیں کاٹ رہا ہے۔

شانِ فقرِ غیور

محمد طاہر صاحب فاروقی "سیرتِ اقبال" میں لکھتے ہیں کہ :۔

"ایک دفعہ سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد نے آپ کو توشہ خانہ
سے ایک ہزار روپیہ کا چیک بھیجا۔ چونکہ یہ دوستانہ تحفہ نہ تھا بلکہ
روپیہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا جس کا لینا علامہ کی غیرت کسی طرح
منظور نہ کر سکتی تھی اس لئے آپ نے چیک واپس کر دیا اور یہ شعر لکھ
بھیجے ؎

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات" (ارمغان حجاز)

کہانی کے مصنف لکھتے ہیں کہ :۔

"اپنے فقرِ غیور کے لئے اقبال کی ہستی شاید اسلامی تاریخ میں اپنی مثال
آپ ہو گی۔ ایک دفعہ اقبال ڈے کے موقع پر سر اکبر حیدری وزیر اعظم
دولت آصفیہ حیدر آباد نے اقبال کی ذات سے پورے ملک
کی عقیدت مندی اور اس کے بلند جذبات کے اعتراف کے طور پر محکمۂ
توشہ خانہ عامرہ کے ذریعہ ایک بڑی رقم اقبال کو بھیجی لیکن
اقبال نے اس بلیغ قطعہ کے ساتھ یہ رقم جوں کی توں سر اکبر حیدری
کو واپس کر دی۔"

اب اس واقعہ میں سر اکبر نذر علی حیدری کے تعلقات اور دیگر امور پر بھی نظر کرنی چاہیئے۔ ۱۹۱۰ء میں جب علامہ حیدر آباد گئے تھے تو سر اکبر حیدری نے ان سے نہایت احترام و محبت کا برتاؤ کیا اور بیگم حیدری نے اکثر اصحاب سے ملاقاتیں کرائیں۔ علامہ کے دل پر ان کے اخلاق کا نہایت گہرا اثر تھا۔ چنانچہ عطیہ بیگم فیضی کو ایک خط میں لکھا کہ :-

"حیدری صاحب ایک پابند وضع اور وسیع المشرب بزرگ ہیں۔ اُن سے ملاقات کے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد و شمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ قدرت نے انھیں درد دل اور فکر بلند کی نعمت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ان دونوں کے لئے میرے دل میں بیحد احترام ہے۔" (۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء)

اس سفر میں ایک نظم "گورستان شاہی" لکھی جس کی نثری تمہید میں لکھتے ہیں کہ :-

"حیدر آباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد محکمہ فنانس جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرتناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلودہ آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی

موش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار
ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدر آباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور
کی لئیق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں
ہوں نے میری مہماں نوازی اور میرے قیام حیدر آباد کو دلچسپ
ین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔"

یہ مخلصانہ تعلقات روز بروز وسیع و مستحکم ہوتے رہے۔ ادہر
سر اکبر حیدری حکومت نظام میں مسلسل ترقی کرتے رہے اور آخر
وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ وہ جب ایک مقتدر عہدے پر
پہنچے تو ان کی خواہش ہوئی تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں جو نئی نئی قائم
ہوئی تھی علامہ کی قابلیت سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن علامہ
کورٹ کی ججی کے متمنی تھے اور سر اکبر حیدری اُن کی اس خواہش
کو بوجوہ پورا نہ کر سکتے تھے مگر تعلقات اپنی جگہ بدستور تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب علامہ پھر حیدر آباد گئے تو سر اکبر حیدری نے
اس وقت فنانس منسٹر تھے بڑی خاطر و مدارات کی اور خود اپنے
لے جاکر نظام سے ملاقات کرائی۔ سول سروس کی طرف
ایک بڑا شاندار ڈنر بھی دیا گیا۔ علاوہ بریں بقول علامہ
ء میں انگلستان سے سر اکبر حیدری نے ایک خط میں
تھا کہ :۔

"اگر حج بیت اللہ تمہاری معیت میں نصیب ہو تو بڑی
خوشی کی بات ہے۔"

(خط علامہ اقبال بنام مخدوم الملک میراں شاہ اگست ۱۹۳۷ء)

ان تعلقات کو پیش نظر رکھنے کے بعد ایک ہزار کے چک کا
واقعہ دیکھا جائے۔

وزارت فنانس اور وزارت عظمےٰ میں ایک مخصوص رقم
اس لئے رکھی جاتی تھی کہ وزرا اور صدر اعظم مختلف اغراض کے
لئے اپنے اختیار تمیزی سے مستحقین اور ضرورت مند لوگوں کو مدد
دیتے رہیں۔ اور اس مد کا نام "مد تواضع" تھا۔

سر اکبر حیدری نے وزارت فنانس کے زمانے میں اسی
مد سے علامہ کی کئی دفعہ مدد کی مگر اس کی شکل یہ تھی کہ اپنے چک
سے ادا کرتے تھے۔ اب جبکہ مارچ ۱۹۳۷ء میں وہ وزیر اعظم
ہوئے تو کچھ عرصے بعد علامہ کی علالت کے زمانے میں انھوں نے
ایک ہزار روپیہ منظور کیا اور غلطی سے اس کا چک دفتر سے جاری
ہوگیا۔ اس رقم اور نظم کے متعلق ارمغان حجاز کے ص ۲۷۷ پر
جس کا حوالہ سیرت میں بھی ہے یہ نوٹ ہے:۔

"یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف
سے جو صاحب صدر اعظم کے تحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چک
بطور تواضع موصول ہونے پر"

ارمغانِ حجاز علامہ کی رحلت کے چھ ماہ بعد نومبر میں جا
اقبال صاحب نے شائع کی مگر چیک کی واپسی کا وہ ذکر نہیں کر
یوم اقبال ۷ جنوری ۱۹۳۸ء پر حیدر آباد میں دو نہایت
عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے تھے۔ اور حیدر آباد کی حالت
دیکھتے ہوئے قیاس بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ معمولی رقم اس تقر

اور وہ بھی اقبال کی ذات سے پورے ملک کی عقیدتمندی اور بلند پایہ خدمات کے اعتراف میں بھیجی گئی پھر یہ کہ قطعہ میں جو استعارات و تلمیحات ہیں وہ کسی رقم پر منطبق نہیں ہوتے۔ شکوہِ پرویز۔ ملوکانہ صفات شہنشاہی۔ حسن تدبیر۔ زکات خدائی۔ تو ایک مقتدر اور بااختیار عہدے پر منطبق ہوتے ہیں۔ علامہ کا یہ قطعہ دراصل عرفی کے اس شعر کا جواب ہے ؎

بگرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن صدقہ نہ شرط انصاف است

بلاشبہ ان کا تخیل عرفی سے بہت بلند ہے مگر چیک کے واقعہ کے ساتھ چسپاں نہیں ہوتا۔

بھوپال سے جو وظیفہ مقرر ہوا علامہ اسکو بھی ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اور اس کے اخفا کی سخت قدغن تھی (ملاحظہ ہو خط موسومہ سر راس مسعود) اس پر قیاس کرنا پڑتا ہے کہ ان کی افتاد طبع کیا تھی اور صحیح معلوم نہیں ہو سکتا کہ حقیقی شانِ فقر غیور کیا تھی؟

ایک طرف سر اکبر حیدری کا سفر حج کے متعلق وہ خط ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے دوسری طرف ہمارے سامنے جاوید نامہ کی وہ نظم ہے جس کا عنوان ہے۔

"روح انسان نالہ و فریاد می کند"

کے شب ہندوستاں آید بروز / مرد جعفر زندہ روح او ہنوز
تا ز قید یک بدن وامی رہد / آشیاں اندر تن دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا ساز باز / گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
دین او آئین او سوداگری ست
عنتری اندر لباس حیدری ست

چوتھے شعر میں کتنا صاف اور واضح حملہ ہے جس کی کوئی لاکھ تاویل کرے مگر پھر بھی یہی سمجھا جائے گا کہ علامہ کے ذہن میں اُن کے دوست حیدری (سر اکبر نذر علی) ہی تھے۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی جبکہ علامہ حیدرآبادی توقعات سے مایوس ہو چکے تھے جیسا کہ سر سیّد راس مسعود کے نام کے خطوط سے ظاہر ہے علاوہ ازیں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں دونوں کے درمیان تلخ گفتگو بھی ہوئی تھی۔

فقرِ غیور کے سلسلہ میں ایک اور بیان ہے کہ:۔

"یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی زندگی میں کسب مال اور حصول منصب کی ہزاروں شکلیں پیدا ہوئیں لیکن ان کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت نے اپنی غیرت و خودداری میں کبھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا وہ کسی قسم کے نقصان منّت پذیری یا غرض جوئی کو تصوّر میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔"

دوسرے مصنف لکھتے ہیں کہ:۔

"۱۹۳۱ء سے انہوں نے وکالت ترک کر دی تھی ۱۹۳۲ء میں نزول الماء کی تکلیف سے ان کے لئے لکھنا پڑھنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ اس طرح اب ذریعۂ معاش باقی نہ رہا تھا۔ ان کی صحت اور مالی حالت خراب ہو گئی تھی۔ پوری عمر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی دفعہ یکمشت پچیس تیس ہزار روپیے انھیں اپنی تصانیف سے حاصل ہوئے تھے جس سے

انھوں نے جاوید منزل تعمیر کی۔ اس کے سوا اُن کے پاس
کوئی اندوختہ نہ تھا اب پیری و علالت دونوں نے مل کر بہ یک
وقت ان پر حملہ کر دیا تھا، مالی نقطہ نظر سے یہ زمانہ بڑی تکلیف
کا تھا، اس زمانہ میں نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے
دیرینہ تعلقات دوستی و محبت کے تحت اپنی جیبِ خاص سے
پانچ سو روپیہ وظیفہ ماہانہ مقرر کر دیا، اس کے بعد ہزہائنس
آغا خاںؒ نے بھی انھیں وظیفہ دینا چاہا اور دیگر ذرائع سے
بھی اُن کی مالی امداد کی کوششیں کی گئیں لیکن اُن میں سے
کسی کو بھی اُنھوں نے قبول نہیں کیا۔ (۱۷۲/۳ سیاسی کارنامہ)

یہ بیان حقیقت کے خلاف ہے۔ آئندہ باب میں بھوپال کے وظیفہ کا ذکر
تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ایک لاکھ کے کیسۂ زر سے انکار

" اقبال کے عقیدت مندوں اور معترفوں نے ایک اور
اقبال ڈے کے موقع پر قوم کی جانب سے اقبال کی بارگاہ
میں اپنی عقیدتمندی کا ایک مادی ثبوت پیش کرنے کے لئے
ایک لاکھ کا کیسۂ زر نذر کرنے کی تجویز پیش کی اس تحریک نے
برق رفتاری کے ساتھ کامیابی حاصل کی، اقبال کو جب اس
تجویز کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے اس کے بانیوں کو لکھا کہ

ؒ سر آغا خاں کا وظیفہ جاوید کے نام چاہتے تھے۔

شاعر انسانیت کے درد کی دوا اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ انسانیت کے درد کا شریک اور مشاکل حیات اور زندگی کی کشمکشوں سے اپنے بل بوتے پر نپٹنے اور ان کو اپنے زور بازو سے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ عیش و تنعم کی زندگی شاعر کو الہام سے محروم کر دیتی ہے وہ پھر انسانیت کے کسی درد کی دوا نہیں بن سکتا۔ آج اگر اقبال آپ کی نظر میں انسانیت کی کوئی خدمت کر رہا ہے تو یہ محض اس وجہ سے کہ وہ اُن کے آلام میں خود شریک ہے تو کیا یہ کیسۂ زر پیش کر کے قوم کو اقبال سے محروم کر دینا چاہتے ہو اُس نے اس تحفۂ زر کے لینے سے انکار کر دیا، اور معطیوں کو اُن کے عطیے واپس کئے گئے،

چوں بہ کمال میرسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

صمدیت کی اس بلند شان کا مظاہرہ اقبال نے اس وقت کیا ہے جب کہ وہ اپنے فکری استغراق اور گوناگوں امراض کی وجہ سے کسب معاش پر توجہ نہ دے سکتے تھے اور انتہائی تنگدستی سے زندگی بسر کر رہے تھے قلبی حملوں نے ان کی زندگی کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا"......

"تنگدستی اس کی فقیرانہ غیرت کے لئے ہمیشہ ایک مہمیز کا کام دیتی تھی۔ اور جتنی زیادہ تنگدستی کا اس پر بوجھ پڑتا اتنی ہی زیادہ اس کی خودداری نمایاں ہوتی تھی اسی قسم کے

ایک امتحان کے موقع پر اس نے اپنے پیر و مرشد رومی کی جانب رجوع کیا تھا رومی کا جب یہ جواب اُس کو ملا کہ

بندۂ یک مردِ صاحب دل شوی
بہ کہ بر فرق سرِ شاہاں روی

تو اقبال کی شانِ صمدیت میں چار چاند لگ گئے اور اس نے دریا کے بلبلوں سے غیرتِ مردانہ کا ایک نادر سبق حاصل کیا

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش"

"اقبال نے اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے ابتلائی دور میں جس خودداری بے نیازی اور عظمتِ نفس کا ثبوت دیا ہے اس سے اس کے فکر اور عمل کی یکسانیت کا پتہ چلتا ہے اس نے اپنے عمل کو اس فکر کے مطابق بنائے رکھا

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیز وجود من
"نہ گیرم گر مرا بخشی حیاتِ جاودانی را"

(دکھائی)

اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے (جیسا کہ ادعا کیا جاتا ہے)، کہ اقبال میں ایک خاص مذہبی جوش اور ملی ولولہ تھا؛ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق مستقبل کے خطرات کا احساس بدرجہ اتم تھا۔ طرابلس و بلقان اور ترکی و فلسطین کے بھائیوں کا دل میں درد تھا۔ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کی اہمیت

ضرورت بھی پیش نظر تھی جس کے لئے مصر و شام اور عرب سے مواد بھی جمع کیا تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ اسلام کو خطرہ سے نکالنے کے لئے ایک بہت بڑا نیشنل فنڈ ہو جو مسلمانوں کے تمدنی اور سیاسی حقوق کی حفاظت اور دینی اشاعت پر خرچ ہو۔ مسلمانوں کی دینی اور سیاسی اعتبار سے تنظیم کی جائے۔ قومی عساکر بنائے جائیں مسلمان اخباروں کو قومی کیا جائے، اور ان تمام وسائل سے اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کا مستقبل محفوظ کیا جائے اور ان امور کے متعلق حوصلہ وعزم یہ تھا کہ

"اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مجھے اپنے کام چھوڑنے پڑیں تو انشاء اللہ چھوڑ دوں گا، اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی ایک مقصد جلیل کے لئے وقف کر دوں گا"

(خط بنام منشی صالح محمد صاحب، ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء)

وہ ایک ایسا اسلامی اقامتی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے کہ:

"جس میں علوم جدیدہ و دینیہ کے فاضل ماہر جمع کئے جائیں جو اپنی زندگیاں اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر تیار رہیں" (خط بنام شیخ جامعہ ازہر ۲۵۱)

اس موقع پر خیال ہوتا ہے کہ یہ ببینہ کیسہ زر ان اہم مقاصد پر صرف ہو سکتا تھا۔

وائسرائے کی ایک دعوت سے انکار

اقبال کی حریت واستغنا اور انگریز سے تنفر کے واقعات میں ایک یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ:-

"ایک دفعہ دِلّی میں وائسرائے سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وائسرائے نے اُن سے کہا کہ کل کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ .... علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل دلّی سے لاہور چلا جاؤں گا، اس لئے آپ کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔"

(۳۳۰۔ سیاسی کارنامے)

لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ ملاقات کہاں اور کب ہوئی، کون وائسرائے تھا، خود اقبال نے یہ روایت بیان کی یا کسی اخبار میں مشتہر ہوئی اس مجہولیت پر درایتاً نظر ڈالی جائے۔

وائسرائے سے ملاقاتوں اور دعوتوں کے آداب و ضوابط مقرر تھے، سرکاری ڈنر پر جن کو بلانا مقصود ہوتا تھا ان کو کافی عرصہ پہلے اطلاع دی جاتی تھی اور اس کا جواب بھی لازمی ہوتا تھا۔ پرائیویٹ دعوت کے لئے ملٹری سیکریٹری خط بھیجتا تھا، یہ ایک معمولی واقعہ تھا اور اقبال کا دعوت میں مدعو کیا جانا ان کے مرتبہ کے مطابق تھا مگر سوانح نگار نے ایسے رنگ میں پیش کیا جس کو بصیرت قبول نہیں کرتی اسی طرح کا ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ:۔

ایک معزز عہدہ سے انکار

"ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بی بی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک

ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور خود لارڈ ولنگڈن (وائسرائے وقت) سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہ گار آدمی ہوں احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوئی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کا حکم توڑ دوں"

(۳۲۲۔ سیاسی کارنامہ)

اگرچہ اس باقاعدہ پیش کش کا کوئی زمانہ متعین نہیں کیا گیا لیکن وائسرائے کا نام تحریر ہے۔ اور یہ وائسرائے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک تھا۔ گویا اس زمانہ میں ہی یہ عہدہ پیش ہوا، اگر باقاعدہ طور پر اقبال کو اطلاع دی گئی تو اس میں شرط کا اندراج بھی ہوگا۔ جواب بھی باقاعدہ تحریری ہوگا۔ ان کا اقتباس و حوالہ ضروری تھا، اور وائسرائے سے یہ گفتگو کس موقعہ پر ہوئی یہ مجہول ہے اور جواب بھی نہ صرف وائسرائے کے آداب بلکہ اخلاق کے خلاف ہے، اور پھر یہ زمانہ تو علامہ کی علالت کا تھا اور ایک رفیقۂ حیات کی دائمی جدائی سے بچوں کی ذمہ داری کا تھا اور دو تین سال سے علامہ مرحوم بیمار چلے آ رہے تھے، ابتدا میں سنگ گردہ کی تکلیف تھی جس میں حکیم نابینا صاحب کے علاج سے فائدہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں آپ عید کی نماز پڑھ کر واپس آئے تو گرم دودھ میں سوئیاں ابال کر کھائیں تو اس سے عجیب اثر پیدا ہوا کہ آواز بیٹھ گئی لاکھ ڈاکٹری علاج کئے مگر افاقہ نہ ہوا، آخر حکیم نابینا صاحب کی دوا سے اس شکایت میں

کافی تخفیف ہو گئی، درد گردہ اور نقرص کے دورہ ہوتے رہتے تھے، ۱۹۳۵ء میں آپ کی رفیقۂ حیات آپ سے جُدا ہو گئیں۔ اس کے بعد کھانسی، دم کشی اور ضعفِ قلب کی تکالیف مستقل طور پر رہنے لگی تھیں۔ تھوڑا سا چلنے پر بھی سانس پھول جاتا تھا، گویا ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء زمانۂ علالت ہے۔

علامہ کا خطاب نائٹ ہڈ

علامہ اقبال کے خطاب (سر) کو بھی سوانح نگاروں نے ایک خاص موضوع روایات بنا لیا ہے۔

"مثلاً عام طور سے مشہور رہے کہ حکومت کے کاسہ لیسوں کو خطابات ملا کرتے ہیں، یہ خطاب ایک ایسے شخص کو ملا جو ملوکیت کا سخت دشمن اور جمہوریت کا زبردست حامی آزادی کا علمبردار اور انقلاب کا نقیب تھا۔"

اس ضمن میں ایک انگلستانی صحافی بھی نمایاں ہوتا ہے جس کا کوئی نام و نشان نہیں بتایا گیا مگر ادبی دنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا اور ممالک اسلامی کی سیاحت کرتا ہوا لاہور پہنچا تھا اور گورنر کا مہمان تھا اور جس کو ترکی سے افغانستان تک جس اسلامی قلمرو میں گذرنے کا اتفاق ہوا تھا ڈاکٹر اقبال کا نام ہر جگہ سُننے میں آیا تھا اُس نے میزبان سے علامہ کی ملاقات کی خواہش کی مگر ارباب حکومت چونکہ ہمارے ادبی مشاہیر سے بے خبر ہیں اور ان کے کارناموں سے نا آشنا ہوتے ہیں اس لئے کچھ تعجب نہیں اگر گورنر پنجاب اقبال کی عظمت سے ناواقف نکلا، تاہم اخبار نویس نے انھیں مجبور کیا کہ

وہ گورنمنٹ ہاؤس میں چاء پر علامہ کو مدعو کر کے ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع دے چنانچہ علامہ ایک دوست کے اصرار پر گئے اور وہیں گورنمنٹ ہاؤس تک پہونچا بھی آئے، علامہ ملاقات کے بعد سیدھے اُن کے یہاں گئے اور متذکرہ بالا واقعہ من وعن سنایا۔

اس کے چند دن بعد آپ کے روبرو "خان بہادر" کے خطاب کی تجویز پیش کی گئی جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد شمس العلماء کی تجویز ہوئی اُسے بھی آپ نے رد کر دیا، بالآخر جب نائٹ ہڈ کی تجویز ہوئی تو اس کو قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل تھا لیکن نواب سر ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر اس پر رضامند ہو گئے۔

ذکر اقبال کے مصنف نے نواب سر ذوالفقار علی خاں کو ہی اس خطاب کا محرک بتایا ہے کہ اُن سے اور سر میکلاگن گورنر سے گہرے تعلقات تھے انھوں نے ایک دن بنگال کے مشہور شاعر ٹیگور کی مثال دے کر اور اقبال کی قابلیت شاعری وغیرہ دکھا کر قدر دانی سے محرومی کا ذکر کیا، گورنر نے پہلے خان بہادر اور پھر شمس العلماء کا خطاب تجویز کیا، مگر نواب موصوف نے نامناسب قرار دیا۔ اتنے میں گورنر نے علامہ کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا جب علامہ پہنچے تو بڑے تپاک سے ملاقات کی اور بتایا کہ لندن ٹائمس کے ایک مقالہ نگار میرے مہمان ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہاں ہیں، اس مقالہ نگار نے اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا تھا اور مشرق وسطی کے جن جن ملکوں میں گیا تھا اُن کے علمی وادبی حلقوں میں علامہ اقبال کے کمالات کا چرچا سن آیا تھا، اسکے

علاوہ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کے متعلق علامہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔

یہ صحبت دو تین گھنٹہ جاری رہی آخر میں سرایڈورڈ میکلاگن نے علامہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ادبی خدمت کے صلہ میں آپ کے لئے سر کے خطاب کی سفارش کروں، علامہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں خطابات واعزازات کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ علامہ نے دیکھا کہ اُن کے انکار سے گورنر کی طبیعت مکدر سی ہوگئی اور یہ قدرتی بات تھی کہ ملکی عوام میں سیاسی لیڈروں نے خطابات کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی، اور لوگ عام طور پر خطاب کو غیر ہر دلعزیزی کا سامان سمجھنے لگے تھے، گورنر سمجھے کہ اقبال بھی اس معاملہ میں عوام کے ہی ہم خیال ہیں لیکن جب علامہ نے کہا کہ اگر آپ کو اصرار ہے تو خیر یوں ہی سہی۔ تو گورنر صاحب کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

دونوں روایات میں جو اختلاف اور مجہولیت ہے ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ حکومت اہل علم وفضل کو بھی ایسے اعلیٰ خطاب سے نوازتی تھی اور اب تک جن کو سر کا خطاب ملا تھا ان میں کسی مسلمان کا نام نہ تھا۔ علامہ اپنی تصانیف وشاعری کی وجہ سے یورپ میں بھی مشہور تھے۔ خود علامہ نے اپنے خط موسومہ شاد ۱۳ رجنوری ۱۹۲۳ء میں لکھا ہے کہ:-

"یہ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہوتے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔ دنیوی نقطہ نگاہ سے یہ ایک قسم کی عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ کے لئے ہے۔"

اکتوبر میں وائسرائے نے پنجاب ہائی کورٹ کے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر میں علامہ کی تعریف بھی کی تھی اس کی نسبت فناد کو لکھتے ہیں کہ :۔

"تقریر نہایت دلکش اور نہایت عمدگی سے ادا کی گئی۔ اقبال کی تعریف سے سب کو تعجب ہوا کہ اس کی توقع نہ تھی اخباروں میں امید تھی کہ یہ تقریر سرکاروالا کی نظروں سے گزرے گی"

مولانا عبدالماجد کو اس خطاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

"آپ کے مختصر الفاظ نے اس موقع پر میرے جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ حالات مختلف ہوتے تو میرا طریق عمل بھی اس بارے میں مختلف ہوتا لیکن یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، ہاں کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے"

اس وقت تک اقبال سیاسیات سے الگ تھے اور تحریک ترک موالات کی بھی تعلیمی حیثیت سے بحیثیت معتمد اسلامیہ کالج انھوں نے سخت مخالفت کی تھی۔

نہ ملوکیت کے دشمن تھے نہ جمہوریت کے نقیب۔ خود ان ہی کی چند نظموں سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ حکام اقبال کی عظمت سے واقف تھے اور ان کو خطاب کا بہر صورت استحقاق بھی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے سر محمد شفیع اور سر فضل حسین سے بہت گہرے تعلقات تھے اور سر شفیع تو اس وقت حکومت ہند کے ممبر قانون و تعلیم بھی تھے، دہلی کی جدید یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر عبدالرحمٰن کو جو صرف قانون پیشہ تھے سر کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ اقبال تو بار ایٹ لا بھی

تھے، اور علمی شہرت رکھتے تھے۔ اس لئے سر شفیع کی نسبت جو بعض اصحاب کا خیال ہے کہ وہ محرّک تھے صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس خطاب کے لئے بھی قاعدہ تھا کہ اگر ایگزیکٹو کونسل کا کوئی رکن سفارش کرے اور جب وائسرائے بھی منظور کر لے تو صوبہ کے گورنر سے بھی دریافت کیا جائے کہ اس کو تو کوئی اعتراض نہیں اس سلسلہ میں گورنر بھی آتا ہے۔

عزم و عمل نظم میں تو علامہ کی ہمت اس قدر بلند تھی کہ دوسرے انسان کے خیال کی رسائی بھی وہاں تک ممکن نہیں لیکن عمل میں اس کی سطح نیچی نظر آتی ہے۔

مثلاً ایک اعلیٰ مقصد سے سنہ ۱۹۲۹ء میں ممالک اسلامیہ کے سفر کا عزم کرتے ہیں۔

"اب باوجود مالی مشکلات کے ایران و ترکی کے سفر کی تیاری میں مصروف ہوں خداوند تعالیٰ پر بھروسہ ہے اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ اس سفر کے لئے جو میں محض اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے اختیار کر رہا ہوں زادِ راہ میسّر آجائے گا"

(۱۸ فروری سنہ ۱۹۲۹ء)

"میں ترکی اور مصر کے سفر کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں جیسا کہ آپ جانتے ہیں "زر می طلبد" والا معاملہ ہے اور ہندوستان کے مسلمان امراء اسلام کی راہ میں خرچ کرنے کی ضرورت و اہمیت سے قطعی ناآشنا ہیں"

(۳۱ مئی سنہ ۱۹۲۹ء)

"ابھی تک اسلامی ممالک کی سیاحت کا کوئی امکان نظر نہیں"

آتا مالی مشکلات ہنوز سدِّ راہ ہیں۔" (۱۱ر اگست ۱۹۲۹ء)

(خطوط بنام محمد جمیل بنگلوری)

غرض یہ سدِّ راہ حائل ہی رہی اور دُور نہ ہوئی، لیکن مسلمان امراء کی ناآشنائی ضرورت کی شکایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید بعض امرا سے زادِ راہ کے لئے خواہش کی ہو۔ کاش وہ اس خدمت کا اعلان کر دیتے تو یقیناً امرا کیا غربا ہی اس کو پورا کر دیتے اور ایک لاکھ کیسۂ زر والے ان مشکلات کو دُور کرنے کے لئے بے تابانہ آگے بڑھتے۔

اس کے ساتھ ایک ایسے عزم کو بھی دیکھئے جس کا تعلق اپنے ہی جذبات سے تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اکبر کو لکھتے ہیں کہ:-

"خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسولؐ نصیب کرے مدّت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب جوان ہوتی ہے۔" (مجموعہ مکاتیب اقبال صفحہ ۳۶)

ربع صدی بعد ۱۵ر جنوری ۱۹۳۷ء کو خط موسومہ سیّد راس مسعود میں لکھتے ہیں کہ:-

"امسال دربارِ حضورؐ میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش آ گئے۔ انشاء اللہ امید کہ سال آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا۔"

مگر افسوس کہ یہ آرزو ۲۵ سال میں بھی جوان نہ ہو سکی حالانکہ مالی مشکلات اتنی آسان ہو گئی تھیں کہ تمام عمر کا اندوختہ نادر شاہ کی نذر یا امداد کے لئے پیش کیا اور پچیس ۲۵ تیس ۳۰ ہزار روپے سے جاوید منزل تعمیر کی۔

اور پھر ایک آسان سفر کا موقع ملا جب کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے خرچ پر لندن سے یروشلم گئے، اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ علامہ یہ لکھتے ہیں کہ :-

"مدینۃ النبیؐ کی زیارت کا قصد تھا مگر میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ دنیوی مقاصد کے سفر کرنے کے ضمن میں حرم نبوی کی زیارت کی جرأت کرنا سوءِ ادب ہے، اس کے علاوہ بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرم نبویؐ کی زیارت کے لئے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے ان دو خیالوں نے مجھے باز رکھا ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا۔"

(خط مولوی محمد صالح صاحب ۱۶ فروری ۱۹۳۲ء)

کوئی سیرت نگار یہ بیان نہیں کرتا کہ ان متذکرہ اعلیٰ مقاصد کے لئے کیا اقدامات ہوئے۔ یا یہ کہ کیا مواقع تھے کہ جن کی وجہ سے عمل پیرائی نہ ہو سکی، اور پھر یہ کہ، ایک ایسا نادر موقع بھی آگیا تھا کہ ایک معقول رقم یعنی ایک لاکھ بصورت کیسۂ زر حاصل ہو رہی تھی جس کو ان میں سے کسی ایک مقصد پر صرف کیا جاسکتا تھا۔ اس کو کیوں ضائع کر دیا؟ اُن کے سامنے ایسی مثالیں تھیں کہ بعض مشاہیر کو تھیلیاں پیش ہوئیں۔ اور انہوں نے قبول کر کے اُن کی رقم قومی مقاصد پر صرف کیں، اس فنڈ کو نیشنل فنڈ کا سرمایہ بنایا جاسکتا تھا۔ جس سے کام شروع ہو جاتا جو بتدریج اضافہ پذیر ہوتا یا پنجاب کے کسی گاؤں میں جیسا کہ خیال تھا اسلامی اقامتی ادارہ کی بنیاد ڈالتے۔ یہ ایسا مقدس عزم تھا کہ جس کی ہر طرف سے یقیناً مالی امداد ہوتی، افسوس ہے کہ معطیان نے اپنے

عطیات واپس لے لئے اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ وہ اقبال کے ہی مقاصد عزیز میں سے کسی ایک مقصد پر صرف کریں۔

جو ادارہ وہ قائم کرنا چاہتے تھے اس کا اقدام بھی نہ ہوا۔ البتہ ۱۹۳۷ء میں چودھری نیاز علی نے پٹھان کوٹ میں ایک دار الاسلام کی تاسیس کی تھی اُن کو علامہ لکھتے ہیں کہ:-

"اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے جن لوگوں کو کچھ احساس ہے اُن کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں انشاء اللہ آپ کا ادارہ اس مقصد کو بہ احسن وجوہ پورا کرے گا۔

علماء میں مداہنت آگئی ہے یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں اخبار نویس اور آجکل کے تعلیمیافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی عزت و منفعت کے سوا کوئی مقصد اُن کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود مگر کوئی ان کا بے غرض رہنما نہیں ہے۔" (۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء)

کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان حالات میں علامہ خود رہبری کرتے اور ایک نمونہ بن کر دکھا دیتے۔

ایک اہم تصنیف کا ارادہ

علامہ اقبال کی وفات کے ساتھ ہی یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک ایسی کتاب کی تصنیف کا ارادہ رکھتے تھے جس میں بتایا جائے کہ اسلام کیا ہے اور اس کے قوانین کس طرح دَورِ حاضر

نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیے جا سکتے ہیں۔ بعض جلسوں میں یہ بھی کہا گیا کہ انھوں نے اس کتاب کا بیشتر حصّہ لکھ لیا تھا لیکن دیگر حضرات نے اس کی تردید کی اور کہا کہ انہوں نے اس کتاب کے صرف عنوانات اور ابواب قائم کیے تھے اور ان کے ساتھ کچھ تشریحی نکات لکھے تھے۔

کچھ دن ادہر اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پنجاب اسمبلی کے رکن محترم محمد شفیع صاحب نے علامہ اقبال کے اپنے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کچھ نوٹس اقبال اکیڈیمی کراچی کو دیے ہیں۔ یہ نوٹس اس کتاب کے متعلق ہیں جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمیں ان نوٹس کی ایک نقل محترم ممتاز حسن صاحب سکرٹری وزارتِ مالیات حکومت پاکستان کی حسن وساطت سے ملی ہے واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اپنی پیش نظر کتاب کے محض عنوانات لکھے تھے اور کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظوں میں یہ بھی لکھا تھا کہ فلاں عنوان کے تحت کیا کچھ لکھا جائے گا اس سے زیادہ انھوں نے ان نوٹس میں کچھ نہیں لکھا۔ ان نوٹس کو پھیلا کر ایک مفصل مضمون بھی مرتب کیا جا سکتا تھا۔

بعض مقامات پر بات مبہم بھی رہ گئی ہے، اس لئے کہ حضرت علّامہ نے ان نوٹس کو محض اپنی یادداشت کے لئے لکھا تھا۔ دوسروں کو سمجھانے کی غرض سے نہیں لکھا تھا۔ نیز بعض مقامات پر اُن کی تکرار بھی ہو گئی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس ضمن میں جو جو باتیں اُن کے ذہن میں آتی رہتی تھیں وہ انھیں بطور یادداشت نوٹ کرتے رہتے تھے۔

مگر ۱۹۱۷ء[1] میں سرکشن پرشاد کو عدالت العالیہ حیدرآباد کی ججی کے

---

[1] ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء

سلسلہ میں جو خط لکھا ہے اس میں ایک مفصل کتاب فقہ اسلام پر بزبان انگریزی کی تصنیف کا بیان ہے اور اس کے لئے سروشام سے بھی مواد جمع کرنے کا ذکر کیا ہے۔ دوسری کتاب قرآن مجید کے تفسیری نوٹ ہیں جس کے متعلق سید راس مسعود کے خطوط میں جذبہ و جوش کا اظہار ہے۔ اسی غرض سے ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال نے وظیفہ بھی مقرر کیا تھا اور جو لکھنا چاہتے تھے اس پر برسوں غور بھی کیا تھا مگر اس کے لئے بظاہر کوئی عملی اقدام نہیں ہوا۔

اقبال اور ملا

مذہبی مباحث کے سلسلہ میں یہ لکھنا بھی شاید غیر موزوں نہ ہوگا کہ ملاؔ، صوفی، عالم، فقیہ اور واعظ و ناصح جو قدیم الایام سے ہمارے شاعروں کے تیروں کا نشانہ رہے ہیں، ان پر علاّمہ اقبال نے بھی کچھ کم تیر نہیں برسائے اور ایک فاضل ادیب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ان تیروں کو جمع کرکے ایک دلچسپ مقالہ "اقبال اور ملاّ" مرتب کیا جس میں خود ان کی توضیحات و تشریحات نے لطف دوبالا کر دیا ہے۔

انھوں نے ایک موقعہ پر فقہ کی تشکیل جدید کی ضرورت پر بھی اپنے اور علامہ کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے علامہ کے ایک فتویٰ کا ذکر کیا ہے کہ ایک ہندو بیرسٹر نے محض اپنے مطالعہ سے اسلام قبول کیا تھا وہ علامہ کے پاس آئے اور انھوں نے اپنی اس مشکل کا حل چاہا کہ:۔

"میں بیوی بچوں والا ہوں میری بیوی بہت اچھی اور نیک ہے اس کا فوراً مسلمان ہو جانا زیادہ دشوار ہے اور میں ایسا تقاضا بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ اس سے گھر کی

پُرامن فضامیں فساد پیدا ہو جائے گا اور بچوّں پر بھی اثر پڑیگا
اس نے یہ بھی کہا کہ تمام مولوی صاحبان جن سے میں نے
پوچھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اب وہ تم پر حرام ہو گئی ہے۔ اس
کو الگ کر دو۔"

اقبالؔ نے کہا کہ :۔

"دیکھو ہرگز ایسا نہ کرنا وہ بیوی تمھارے لئے بالکل جائز اور
حلال ہے بلکہ پہلے سے بہتر سلوک کرو تاکہ اس کو معلوم ہو کہ
مسلمان ہونے سے آدمی زیادہ بہتر انسان ہو جاتا ہے۔ اب تم کسی
مولوی سے نہ پوچھنا میں نے جو کچھ تمھیں کہا ہے وہ عین اسلام
ہے خواہ کسی فقہ کی کتاب میں درج نہ ہو۔"

اسی ضمن میں خود مقالہ نگار نے اپنا واقعہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے بھی
ایک ایسے ہی موقع پر اقبال والا فتویٰ سُنا کر نومسلم ہندو کو جو ہندو بیوی
بچوّں والا تھا مطمئن کر دیا۔ ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی بھی دلیلیں
پیش کیں۔ (اقبال اور مُلّا ص ۲۳)

اس جدید فقہی مسئلہ وفتویٰ کے مطابق برعکس صورت یعنی مسلم بیوی
اور ہندو شوہر میں بھی عہد حلال ہو گا۔ علامہ غالباً مہاراجہ سرکشن پرشاد
کا یہ فعل کہ انھوں نے ایک مسلم عورت کو بیوی بنا لیا جائز سمجھتے ہونگے ؟۔
اب اگر علامہ کی فقہ کی تشکیل جدید کا یہی نمونہ ہے تو بہت اچھا ہوا کہ وہ
کتاب مرتب نہ ہوئی جس کے لئے وظیفہ بھوپال مقرر ہوا تھا اور اس طرح
مسلمان ایک بہت بڑے اور نئے فتنے سے محفوظ رہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تفقہ کے لئے قرآن وحدیث کی کامل تعلیم

اقبال کے تعلیمی حالات معرّا ہیں صرف معمولی طور پر عربی پڑھ لینے سے سیرت نبوی صلعم اور آثار صحابہؓ کا عمیق مطالعہ لازمی ہے اور ان علوم سے تفقہ کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی جب تک حدیث کی تکمیل نہ کی ہو۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ وہ ۲۱ سال میں بھی باوجود عزم قوی و شدت احساس اور فراہمی کتب چند صفحے بھی نہ لکھ سکے۔

انھوں نے خود بھی مولوی سیّد سلیمان ندوی کو لکھا تھا:۔

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔" (مکاتیب اقبال)

عملی زندگی پر اعتراضات اور جواب

۱۔ اقبال کی عملی زندگی کی نسبت اُن کی حیات ہی میں اعتراض ہوتے رہتے تھے۔

"ایک بار بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں آیا مختلف سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ وفد کے ایک ممبر نے کہا کہ آپ کی تعلیمات نے مدّت کی سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا اور آپ نے انسانیت اور اسلام کے تمام اسرار و رموز ہم کو سکھا دیئے۔ لیکن ہمیں شکایت ہے کہ آپ نے خود نمونہ عمل پیش نہیں کیا۔"

سر اقبال نے جواب میں فرمایا کہ:۔

"کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور تمھارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی ہے میرا کام ہے

درس دینا آگے یہ تمہارا ذمہ ہے کہ اِن تعلیمات پر عمل کرو اور میدانِ زندگی میں جہاد کرتے رہو۔"

پھر آپ نے فرمایا کہ :-

"دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی نظریہ قائم کیا ہو اور خود ہی اُس پر عمل کر کے دکھایا ہو، کیا آپ تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں،؟"

اس کے بعد کچھ دیر تک سکوت کر کے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا اور فرمانے لگے :-

البتہ دنیا میں صرف ایک ہی ایسی ہستی گرامی ہے کہ جس نے ایک درس اور پیغام پیش کیا اور پھر خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا آپ لوگ جانتے ہیں وہ شخصیت کون تھی، وہ ذات محمدؐ عربی صلعم کی تھی یا پھر مثال میں حضرت موسیٰؑ کا نام لیا جاتا ہے۔"

(سیرت اقبال - ص۱۱۱)

۲- ایک اور جواب بھی قابل ملاحظہ ہے جو مولانا محمد علی (مرحوم) کو دیا۔

"تم نے دیکھا ہو گا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے۔ لیکن سننے والے ہو حق کرتے ہیں وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں۔" (ص۳۴۴ سیاسی کارنامہ)

قوال تو سامعین کو محض اپنی موسیقیت اور کمال فن سے وجد میں لاتا ہے۔

اس پر شعر کے مضمون کا کچھ اثر نہیں ہوتا، اس کا دل و دماغ عرفانی و وجدانی کیفیتوں سے خالی ہوتا ہے، اس مثال سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ اقبال کا کمال قابلیت وفن تھا ورنہ اُن کے دل و دماغ اِن افکار سے متاثر نہ تھے۔

اُن کے ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:۔

"اپنے وظیفۂ حیات کے متعلق اُن کا یہ وجدان اور طبعی میلان بالکل درست تھا جس کو عملی یا سیاسی زندگی کہتے ہیں اس سے ان کی قوتیں مرتکز ہونے کے بجائے منتشر ہو جاتیں اور اقبال اقبال نہ بن سکتا۔ وہ سیاسی اور عملی زندگی کے مرد میدان نہ تھے۔" (نقوش شخصیات نمبر)

۳۔ اسی سلسلہ میں ایک اور بیان بھی ہے:

"ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے ایک دن علامہ اقبال سے سوال کیا کہ آپ کے اشعار نے ہندوستان میں آزادی کی روح پھونک دی لیکن آپ خود اس سلسلہ میں کچھ بھی عملی جدّ و جہد نہیں فرماتے علامہ نے بیساختہ جواب دیا کہ، شعر کا تعلق عالم علوی سے ہے چنانچہ جب میں شعر کہتا ہوں تو عالم علوی میں ہوتا ہوں لیکن یوں تو میرا تعلق عالم اسفل سے ہے۔ اس طرح تم میرے اشعار اور عمل میں کس طرح مطابقت دیکھ سکتے ہو؟"

۴۔ بقول مصنف ذکر اقبال:۔ مولوی محمد علی ایم اے کنٹب نے بھی اسی قسم کا سوال کیا تھا جس کا جواب علامہ نے یہ دیا کہ اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات

پر عمل بھی کرتا تو شاعر نہ ہوتا بلکہ مہدی ہوتا۔"

اِن جوابوں سے واقعی امر تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں شاعروں کے متعلق جو کچھ ارشاد ہے وہ منطبق ہو جاتا ہے، لیکن اِن جوابات سے قطع نظر اقبال کو اپنی بے عملی کا خود بھی احساس تھا وہ اُن ہی کے قلم سے دیکھئے۔

۵- اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں کہ :-

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں، یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اور کچھ نہیں، پنجاب میں علماء کا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدا تعالے نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دوکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی، (علماء اور صوفیاء پر اظہارِ خیال کے بعد) اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے، میں بھلا کیا کر سکتا ہوں صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں، قوتِ عمل مفقود ہے، ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔"

اصل حقیقت تو یہی ہے جو اس خط میں ہے، باقی وہ جوابات جو سطورِ بالا میں ہیں کہانیاں ہیں۔

انجمن حمایت اسلام اور علامہ

علامہ کو انجمن حمایت اسلام کے ساتھ خاص دلچسپی تھی اسی کے

پلیٹ فارم سے انھوں نے شہرت حاصل کی۔ اس کے سالانہ جلسوں میں خاص طور پر نظمیں سُناتے تھے۔ اس کے جھگڑوں میں ثالثی بھی کرتے تھے، اس کے سکریٹری اور صدر بھی رہے۔

مگر کوئی سوانح نگار یہ نہیں لکھتا کہ علامہ کی نظموں سے انجمن کو کیا فوائد پہنچے اور یہ نظمیں بحق انجمن رہیں یا خود علامہ کی ملکیت رہیں، نیز یہ کہ اُن کی معتمدی اور صدارت میں انجمن نے مالی واخلاقی طور پر کس قدر اور کیا ترقی کی؟

جہاں تک معلوم ہوا علامہ کی تمام نظموں کے حقوق تصنیف و طباعت محفوظ تھے۔ اس کے ساتھ لامحالہ یہ بات یاد آتی ہے کہ اُن کے پیش رو مولانا حالی کا مُسدّس عام تھا اور شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں وہ طبع اور فروخت نہ ہوا ہو۔ اسی طرح انھوں نے "چُپ کی داد" جو ایک مشہور نظم ہے علی گڑھ کے زنانہ اسکول (بعدہٗ کالج) کو مع حق تصنیف دی، علاوہ بریں "مناجات بیوہ" کا بھی حق محفوظ نہیں کیا۔ دو نظمیں اسلامیہ کالج اٹاوہ کے لئے مخصوص کردیں۔

آثارِ قدیمہ کی عظمت

علامہ پر اسلامی آثار قدیمہ دیکھ کر ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ چنانچہ دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام دیکھنے کے تذکرہ میں بیان کیا کہ:-

"مغرب کا وقت تھا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہوکر نماز ادا کروں، لیکن مسجد کی قوت اور جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا، میرا احساس یہ تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں

ہوں۔"

مگر تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد۔
"علامہ نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں اس عمارت کے نگراں سے پوچھا اس نے کہا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں اُدھر وہ پوچھنے گیا اِدھر علامہ نے نیت باندھ لی، اور اُس کے آنے سے پہلے ہی پہلے ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔"

لیکن اس نماز کا ایک فوٹو بھی ہے جس میں علامہ ایک خوبصورت جانماز پر بحالت قعدہ مغربی لباس میں نظر آتے ہیں۔

حیرت یہ ہے کہ علامہ پہلے تعلیمی سفر کے بعد دو مرتبہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر لندن گئے مگر کبھی ووکنگ مسجد تک جانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ حالانکہ وہ اس زمانے کی ایک بڑی اسلامی یادگار ہے۔ جس سے تبلیغی مقاصد بھی وابستہ ہیں۔ اور اس مسجد میں عیدین و جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔ اور عموماً بلا خیال اختلاف و عقاید جو مسلمان بھی لندن پہنچتا وہ اس بین المسلمین[1] مسجد کی نماز میں ضرور شرکت کرتا۔

حتیٰ کہ اسمٰعیلی فرقہ کے امام سر آغا محمد شاہ خاں کو بھی نماز عید میں ہم امام مسجد کی اقتدا میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر علامہ نے یہ تکلیف گوارا نہ کی کہ وہ اس زندہ یادگار کو دیکھتے اور ووکنگ کے اسلامی مشن کو تقویت پہنچاتے۔

---

[1] یہ مسجد نواب شاہجہان بیگم والی بھوپال نے تعمیر کرائی تھی اور ایک مدت بعد بڑی جد و جہد سے خواجہ کمال الدین نے اس پر قبضہ حاصل کیا۔ نواب سلطان جہان بیگم آخری بیگم فرمانروائے بھوپال نے امام کا مشاہرہ مقرر کیا اور مسجد کی توسیع کرائی۔ لندن گئیں تو نماز جمعہ میں شریک ہوئیں۔

باب ۲

مشاہیر سے تعلقات

اقبال و شاد
مدح اور تمنائیں

سرمہاراج کشن پرشاد المتخلص بہ "شاد" حیدرآباد دکن کے ایک بہت بڑے خاندانی جاگیردار تھے جو ہندو گھرانے میں ہندو والدین سے پیدا ہوئے اور اپنے ہندو اور کھتری ہونے کا باربار تحریری و زبانی اعادہ بھی کرتے رہے۔ آخری وصیت نامہ میں بھی اپنے ہندو اور کھتری ہونے کا اظہار کیا ہے۔ (لائف مہاراجہ کشن پرشاد ۲۸۳) قدیم تعلیم بہت اچھی تھی شعروسخن اور ادب سے ذوق تھا، مزارات پہ حاضری زیارت و منت اور فقراء و مشائخ کی دعاؤں کے بڑے معتقد تھے اور خود کو ایک صوفی کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔

حالانکہ ان کی کئی بیویاں موجود تھیں مگر انھوں نے اپنی صوفی منش

کی نقاب ڈال کر اور اپنے اقتدار و دولت اور رعب وزارت عظمیٰ سے جو نظام سادس میر محبوب علی خاں کے عہد میں تھا ایک سید کی حسین لڑکی کو بیوی بنالیا۔[1]

۱۹۱۰ء میں جب ڈاکٹر اقبال حیدر آباد گئے تو شاد نے بڑی خاطر مدارات کی، اقبال نے واپس آکر ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس کے ساتھ تمہید بھی۔ قصیدہ میں قدیم طرز کی مدحت کا پورا رنگ ہے ضمن میں میر محبوب علی خاں نظام دکن کی بھی تعریف کی ہے۔

۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں نظام سابع فرمانروا ہوئے تو کچھ عرصہ بعد شاد وزارت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ یہ ان کی زندگی کا سخت سانحہ تھا اب مزاروں پر منت و دعا کے لئے انھوں نے ایک دورہ کیا، ۱۹۱۳ء میں لاہور بھی آئے۔ اقبال سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، انجمن حمایت اسلام کے یتیم خانہ کا وفد بھی پیش ہوا جس کو ایک ہزار روپیہ کا عطیہ دیا گیا۔ ڈر ہندو رؤساء نے استقبالیہ دعوتیں بھی کیں چونکہ ان کے مذہب کی طرف سے بدگمانی تھی اس کو دور کرنے کے لئے ایک دعوت میں اپنے ہندو مذہب پر ہونے کا علی الاعلان اعتراف بھی کیا اور نعت لکھنے اور دیگر اسلامی امور میں دلچسپی لینے کی توجیہہ بیان کی۔[2] غرض وزارت کی بے چینی سے مزارات پر حاضری، فقراء و مشائخ اور مجاذیب سے منت و دعا کا غیر منقطع سلسلہ جاری رہا۔

علامہ اقبال کو بھی اُن کی کامیابی وزارت کی کچھ کم تمنا نہ تھی اور وہ بھی اس منت و دعا میں برابر جد و جہد کرتے رہتے تھے اور اُن کی وزارت

---

[1] اس واقعہ پر بہت کچھ ہیجان ہوا مضامین بھی نکلتے تھے [2] مقدمہ اقبال و شاد

سے اپنی اُمیدوں کو وابستہ کرلیا تھا۔ ایک مرتبہ محض افواہ پر یہی ایا۔ قطعہ تاریخ شاد کی خدمت میں بھیجدیا۔

صدرِ اعظم گشت شاد نکتہ سنج ۔۔۔ ناوکِ او دشمناں را سینہ سفت
سالِ ایں معنی سروشِ غیب داں ۔۔۔ جانِ سلطاں سرکشن پرشاد گفت

۱۳۳۱ھ

علامہ اس تمنّائے وزارت کے ساتھ اپنے تعلق اور بالخصوص رکنیت عدالت العالیہ کے متمنّی تھے، یہ تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ علامہ اُن کی لڑکیوں کے لئے شوہر منتخب کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں، اِن دونوں کی مراسلت کیف و والہی اور ادب کا دلچسپ مرقع ہے، کبھی کبھی دونوں اپنے اپنے افکار شاعرانہ بھی لکھتے رہتے تھے:۔

چہ حالِ شاد تو پرسی بگو، تراچہ من گویم
چناں کہ ہست تغیر دریں نمی بینیم

علامہ کو جب سر کا خطاب ملا تو " رہبر دکن " میں کسی نے یہ قطعہ لکھ کر شائع کرایا۔

گر سر ز تن جدا و تن از سر جدا شود ۔۔۔ کے مردِ حق اسیر کمندِ ہوا شود
اقبال راچو قلب کنی لا لقا شود ۔۔۔ تاریخ نو خطاب سرافراز آمدہ

شاد لکھتے ہیں کہ " آپ کے دلی محب کو یہ بہت برا معلوم ہوا اور فوراً ایک قطعہ لکھ کر اسی روز اسی اخبار میں بھیج دیا۔

۔ " جانِ سلطان سرکشن پرشاد " سے اعداد تو نکلتے ہیں لیکن مفہوم وزارت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اغلباً یہ الہامی تاریخ نہیں۔

اقبال ہر کسے کہ ترقی فزا شود	ادبار حاسدش بجہاں لابقا شود
چوں بر وجودِ حاسدِ او نفی آمدہ	تیغ فنا ز بہر لیقا حرف لا شود

(۱۱ر فروری ۱۹۲۳ء)

اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :-

"بھلا یہ دو شعر کیسے ہیں بنظرِ اصلاح ملاحظہ فرمایئے:"

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت	فروغ زندگی تاب شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم	صنم از آدمی پائندہ تر بود

۱۹۲۷ء میں شاد یاوری قسمت سے پھر وزارت عظمیٰ پر فائز ہو گئے ۱۹۲۹ء میں اقبال بھی حیدر آباد گئے، شاد نے بڑی خاطر مدارات کی۔ نظام سے بھی ملاقات ہوئی۔

لیکن اس دہ سالہ دورِ وزارت میں اقبال کا کوئی خواب منت پذیرِ تعبیر نہیں ہوا اور مراسلت میں بھی کمی آگئی اور مکاتیب مرتب کرنے والوں کو اس دس سال کے عرصہ کا ایک خط بھی دستیاب نہ ہو سکا؟

یہاں وہ چند مکاتیب قابلِ مطالعہ ہیں جن میں بعض توضیح طلب امور آئے ہیں اور جو سیرت کا آئینہ ہیں :-

(۱) "راجہ گوبند پرشاد مرحوم مغفور کی خبرِ رحلت معلوم کر کے افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔"[1]

(۳۱ر اکتوبر ۱۹۱۶ء)

---

[1] راجہ گوبند پرشاد انکے علاتی بھائی تھے اور خود مہاراجہ کے اطلاعی خط میں لفظ "آنجہانی" تھا جو مسلمانوں کے ادب میں غیر مسلم متوفی کے لئے مخصوص ہے مگر علامہ نے وہ دعائے مغفرت بھی کر دی جو محض مسلمان کے لئے ہے اور مشرک کے لئے جائز نہیں۔

(۲) "خدائے قادر و قیوم نے کشن پرشاد کو ذو لمنتین کا ہم عدد کیا ہے۔ اقبال پر بھی نظر عنایت رہے اور اوقات خاص میں اس شرمندہ عقبیٰ کو یاد رکھا جائے۔"

(۱۷ر دسمبر ۱۹۱۶ء)

(۳) "تین چار ماہ ہوئے کہ ارادہ مصمم سفر حیدر آباد کا کرلیا تھا مگر استخارہ کیا تو اجازت نہ ملی، کئی باتیں راز کی آپ سے کرنی ہیں گو ممکن ہے کہ میرے حیدر آباد آنے تک وہ راز خود بخود آشکارا ہو جائے اور مجھے افشا کرنے کی ضرورت نہ ہو" (۵ جنوری ۱۹۱۷ء)

اِن رازوں کے متعلق شاؔد جواب میں لکھتے ہیں کہ :-

"خدا جانے وہ راز کون سے ہیں جن کا اظہار کرنے کے لئے آپ بیتاب بھی ہیں اور یہ خیال بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ ممکن ہے میرے حیدر آباد آنے تک خود بخود آشکارا ہو جائے۔"

(۴) "خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو اس خرقہ پوش امیر کی ہم بزمی میسر رہے کیا عجب اللہ تعالیٰ اقبال کے لئے بھی ایسے ہی سامان پیدا کر دے۔" (۲۳ر فروری ۱۹۱۷ء)

(۵) "اللہ اکبر۔ سے دو چار روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا بھی تذکرہ ہوا تھا، ایاک نعبد و ایاک نستعین کا دور دورہ پھر ہو جائے گا مطمئن رہیئے گا۔ آجکل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف

کھینچا ہے کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے، شاد کا پیغام بھی پہنچاؤں گا۔" (۷ مارچ ۱۹۱۷ء)

(شاد کا جواب) :-

"مالک یوم الدین سے اگر اب کبھی ملاقات ہو جائے تو اتنا ضرور کہیئے گا کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین شاید دل سے بھی دور کر دیا، ان نئی مجذوبہ سے ملنے کے بعد ضرور کیفیت مفصل سے ایما کیجیے۔"

(۶) "سرکار نے بجا ارشاد فرمایا کہ انسان تدبیر کا مجاز اور اُس پر ضمناً قادر ہے مگر اس معاملہ میں جس قدر تدابیر اقبال کے ذہن میں آسکتی ہیں ان سب کا مرکز ایک وجود ہے جس کا نام گرامی شاد ہے۔ تقدیر اور تدبیر اسی نام میں مخفی ہیں پھر انشاء اللہ العزیز اقبال ہر حال میں بشاد ہے لاہور میں ہو یا حیدرآباد میں ع :-

اگر نزدیک گر دُور م غبار آں سر کویم

یہاں پنجاب اور یوپی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دُور دُور سے مبارکباد کے تار بھی اڑ گئے[۱]، کل پنجاب کی مشہور انجمن حمایت الاسلام لاہور جو سرکار کی فیاضی سے بھی مستفید ہو چکی ہے، اپنا سالانہ اجلاس کریگی، بھوپال کے پرنس حمید اللہ خاں صدارت کے لئے آئے ہیں اُن کا جلوس سنا ہے بڑی دھوم دھام سے

---

[۱] دلی کی رنگینیٔ عدالت العالیہ

نکلے گا بازاروں کی آرائش ہو رہی ہے، کیا دلکش معنی خیز شعر
کسی ایرانی شاعر کا ہے ؎

برمے کہ درآں سفرہ کشد جلوہ دیدار
کونین غبار یست کہ از بال مگس ریخت"

(۱۰ ر اپریل ۱۹۱۷ء)

(۷) کاغذی ملاقات کا خاتمہ اس کے ید قدرت میں ہے اسے
منظور ہوگا تو اقبال اور آستانہ، شادؔ نے توقع تو ایک پیدا ہوگیا ہے
ممکن ہے کہ سرکار کے جذبات نے اسے پیدا کیا ہو بہرحال اگر
مقدر ہے تو سرکار شادؔ تک رسائی بھی ہو جائے گی، باطنی اعتبار
سے تو بندہ درگاہ وہاں پہلے سے موجود ہے۔"

(۱۴ ر جون ۱۹۱۷ء)

شادؔ نے خط مورخہ ۲ ر مارچ ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا کہ:-
"مجھے اب تک اس کا عقدہ نہ کھلا کہ مجھے آپ سے کیوں دلی خلوص
ہے بجز اس کے کہ آپ ہی کا خلوص اسکا باعث ہو یا عقدہ مجھوں۔
مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ایسے دوست کی کوئی خدمت نہ
کر سکا، اس سفر میں زیر باری بہت ہوئی امید ایک حبہ کی
نہیں، مالک یوم الدین کہاں ہیں ان کی خدمت میں کہہ دیجئے
کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین بڑے ہوشیار ہیں (نعبد) کے مطلب
کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر نستعین پر انجان ہو جاتے ہیں اللہ ان کو

ؔ رگنیت عدالت العالیہ ملاحظہ ہو خط ۱۵ ر اپریل جس میں کوالیفکیشن درج ہیں۔

شاد و بامراد رکھے"۔

دوسرے خط میں لکھا تھا کہ:۔

"بھئی کہو تو مالکِ یوم الدین کہاں ہیں کیا فرماتے ہیں میری طرف سے ایاکَ نعبدو ایاکَ نستعین عرض کرتے ہیں کہ نہیں؟ ان سے اتنا ضرور عرض کرنا کہ فقط ایاک نعبد منظور، اس کے دوسرے حصہ سے اغماض نہ کریں"

جواب میں علامہ کہتے ہیں:۔

(۸) "ایاک نعبد تو کوچ کر گئے اب تو عرش کے قریب ہوں گے یا وہاں تک پہنچ گئے ہوں گے، ایک اور بزرگ لاہور کے قریب ہیں ذرا بارش ہو تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب دعا ہوں گا" (۳۰ جون ۱۹۱۷ء)

(۹) "حیدری صاحب نے جیسا کہ میں نے گذشتہ عریضہ میں عرض کیا تھا مجھے قانون کی پروفیسری پیش کی ہے اور یہ پوچھا ہے کہ اگر پرائیویٹ پریکٹس کے ساتھ اجازت ہو تو کیا تنخواہ لو گے، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میر مجلسی عدالت العالیہ کی خالی ہے نہ اس کے متعلق انھوں نے خط میں کوئی اشارہ لکھا ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو میں اسے قانون کی پروفیسری پر ترجیح دوں گا، آپ حیدری صاحب سے ملیں تو بر سبیل تذکرہ ان کی توجہ اس طرف دلائیں۔ اقبال خواہ حیدرآباد میں ہو یا لاہور میں خواہ مریخ ستارہ میں، وہ غیر محسوس روحانی پیوند جو اس سرکار سے ہے انشاء اللہ العزیز قائم رہے گا۔ نہ وقت اسے دیرینہ کر سکتا

ہے نہ تعلقات اسے کمزور کرسکتے ہیں۔

اگر یہ بندۂ ناچیز وہاں قیام پذیر ہوگیا اور حالات زمانہ نے مساعدت کی تو انشاء اللہ اقبال شاد کے کام آئے گا۔"

(۱۴ اگست ۱۹۱۷ء)

(۱۰) "میرے مقدر کے دالنوں کی آپ کو تلاش ہے تو ممکن ہیں مل جائیں اگرچہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی سرکار مدارالمہام ہوتے تو اس قدر جستجو گوارا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، اگر زمانہ نے مجھے آپ کے آستانہ پر لا ڈالا تو میری عین سعادتمندی ہے اس وقت دوستانہ و نیازمندانہ مہر و وفا کا ثبوت دے سکوں گا۔" (۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء)

(۱۱) سرکار کی صاحبزادی کی علالت کی خبر سُن کر متردّد ہوا ہوں اللہ تعالیٰ صحت کامل عطا فرمائے، انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کرونگا، بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے، بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گذر جاتی ہے سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دعا کرونگا کہ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔ طالع کی پریشانیاں بڑھ رہی ہیں۔"

(۱۷ جون ۱۹۱۸ء)

(۱۲) "سرکار نے یہ کیا لکھا کہ نہ آپ آتے ہو نہ مجھے بلاتے ہو، اقبال ایک مدت سے منتظر امام ہے، کئی سال پیشتر عرض کرچکا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

سرکار ظہورِ امام کی خبر دیتے ہیں، پھر کیا عجب ہے کہ اقبال کی دیرینہ ارادت اور خماری شاد کی کشش متحد ہو کر کام کر جائے اقبال جو معنوی اعتبار سے پہلے ہی شاد کا آستانہ نشین ہے صوری اعتبار سے بھی حاضر ہو جائے، اقبال کی کشش تو ایک عرصہ سے قوت کھو چکی ہے شادی کی کشش کا امتحان باقی ہے۔" (۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء)

(۱۳) "ٹیلیفون کا سلسلہ جاری ہے اور کئی اطراف میں خدا چاہے تو نقش حسبِ مراد بیٹھے گا۔ مگر اقبال آپ کی استقامت اور سکونِ قلب کی داد دیتا ہے۔" (۹ مارچ ۱۹۲۳ء)

(۱۴) "برار کے استرداد میں یادآوری اقبال کی ضرورت ہے۔" (۱۱ مارچ ۱۹۲۳ء)

(۱۵) "خاکسار نے جو پیغام مولانا شاہ تاج الدین صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے۔ اس کا جواب سرکار والا کی خدمت میں پہلے پہنچا ہو گا۔ اخباروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلوبہ[۲] جواب سرکار عالی تک پہنچ گیا ہے لیکن اقبال حضور سے سننے کا مشتاق ہے، تصدیق ہو جائے تو مزید عرض کروں گا۔"

(۲۶ مارچ ۱۹۲۳ء)

---

[۱] سی پی کے ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ۔

[۲] وزارت عظمیٰ کی دعا، قبولیت۔

(۱۹) "مجھے یقین ہے کہ سرکار والا کا تقرر حیدرآباد کے لئے بے انتہا برکات کا باعث ہوگا، بلکہ میں تو اس بات کا امیدوار ہوں کہ سرکار کا وجود، باوجود ان تمام مشکلات کے ازالہ کا باعث ہوگا جو اس وقت ہندوستانی رؤسا، گو درپیش ہیں۔

(یہاں رائل کمیشن کی آمد کا ذکر کرکے اور اس میں ادائے شہادت کے لئے بین الاقوامی مقنّنین کی جماعت تیار کرنے کا مشورہ دیکر لکھا کہ) اگر اس مسئلہ میں اقبال کی ضرورت ہو تو وہ بھی اپنی بساط کے مطابق حاضر ہے۔ انشاءاللہ سرکار والا اسے خدمت میں قاصر نہ پائیں گے۔" (۲۷ دسمبر ۱۹۳۶ء)

اس آخری خط کے بعد جامع "مکاتیب شاد و اقبال" کو اور خطوط مہیا نہ ہوسکے۔

ستمبر ۱۹۱۹ء کے خط میں علامہ نے جو دو شعر کشن پرشاد کے پاس "بنظر اصلاح" بھیجے تھے ان کے مطالب و معنویت اور تلمیح وغیرہ پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی، عام فہم مطلب تو یہ ہوسکتا ہے کہ

'برہمن خدا پر طعن کرتا ہے کہ تیری مخلوق اور پرستار انسانوں سے میرا معبود (یعنی میرا بنایا ہوا بت) زیادہ پائندہ تھا۔'

کیا جناب احدیت میں ایسے مفروضات اور شاعرانہ تخیلات روا ہیں؟ پھر شاد کی نظر اصلاح کیا معنی؟

علاوہ ازیں سورۂ فاتحہ کے الفاظ کا جو استعمال ہوا ہے وہ صاف طور پر منافی ادب و آداب کلام الٰہی سے بعید اور استہزا کے مترادف ہے، اس لئے اس کی توجیہہ و تصریح بھی ضروری تھی۔

نظام سے ملاقات

۱۹۲۹ء میں جب اقبال حیدر آباد پہونچے تو اسٹیشن پر بہت شاندار استقبال ہوا اور وہیں پر ان کو بتا دیا گیا کہ وہ نظام کے خاص مہمان ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں ایک تقریر بھی ٹاؤن ہال میں کی اور نظام سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس گفتگو کو جو اس ملاقات میں ہوئی کوئی سوانح نگار نہیں لکھتا البتہ ایک نے یہ ضرور لکھا ہے کہ :-

"ڈاکٹر صاحب کو قیمتی پتھروں بالخصوص ہیروں سے بہت دلچسپی تھی اور چونکہ ان کو حکیم اجمل خاں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے جو نہایت چمکیلا ہے۔ اس لئے اعلیٰ حضرت کا شرف باریابی حاصل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس ہیرے کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور اعلیحضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا اور ڈاکٹر صاحب اس کو دیکھ کر غایت متاثر ہوئے اور ایک موقع پر اس کی چمک دمک اور حسن وجمال کا تذکرہ نہایت جوش وخروش کے ساتھ کیا۔"

اب اس روایت پر ذرا تنقیدی نظر ڈالئے :-

اسٹیشن پر نظام کی خاص مہمانی کے متعلق بتانے والا مجہول رکھا گیا ہے جن لوگوں کو ریاستوں میں جانے آنے کا تجربہ ہے[1] وہ جانتے ہیں

---

[1] راقم خود دو مرتبہ حیدر آباد گیا ہے۔ پہلی مرتبہ نواب محمد حمید اللہ خاں (بھوپال) کی معیت میں جب کہ وہ صرف تیسرے صاحبزادے تھے ان کے اور ہمراہیوں کے لئے خاص انتظام ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ کے ساتھ وہ ایوان آسمان منزل میں ٹھہرائی گئی تھیں۔

کہ عامۃً ریاست کا افسر متعلقہ استقبال کرتا ہے اور مہمان کو اس کے جائے قیام پر لے جاتا ہے۔ حیدر آباد میں علی العموم ایسے مشاہیر مہمان خانہ ریاست میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اقبال کی خصوصیت نہ تھی۔ البتہ وائسرائے ایوان فلک نما میں ٹھہرتے اور والیان ریاست اور مخصوص اصحاب کے لئے جداگانہ انتظام ہوتا۔ اولین ملاقات میں ہیرا دیکھنے کی بے تکلفانہ خواہش آداب و متانت کے منافی تھی۔ اقبال ایسے بھی الہڑ نہ تھے کہ دیگر مناسب موضوعات گفتگو کو چھوڑ کر ایسی خواہشات کا اظہار کرتے وہ پتھروں کے جوہری بھی نہ تھے۔ البتہ شعر و سخن اور علم و فضل کے جوہر اور جوہری تھے اور اس لحاظ سے نظام کی شاعری اور عثمانیہ یونیورسٹی عمدہ و مناسب موضوع گفتگو تھے۔ اقبال نظام کی شاعری کے معترف بھی تھے۔ اور داد سخن دے چکے تھے۔ (خط موسومہ شاد ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء) عثمانیہ یونیورسٹی کو نظام اپنے مفاخر میں سمجھتے تھے اور اصل میں یہ صحیح بھی تھا۔

سر کشن پرشاد اور اقبال کی مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کشن پرشاد نے اپنے اس طویل زمانہ وزارت میں اقبال کی کیا خدمت کی اور کس امید کو پورا کیا۔ مگر خطوط سے ظاہر ہے کہ اقبال نے۔ ججی عدالت العالیہ کے علاوہ جس کے ۱۹۱۷ء سے متمنی تھے۔ برار کے مقدمہ کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور رائل کمیشن کے وقت بھی۔ مگر ان کو قبول نہیں کیا گیا۔ یہ بات بھی تعجب سے دیکھنے کی ہے کہ علامہ نے دو مرتبہ سفر حیدر آباد کیا اور قیام بھی مناسب مدت تک رہا مگر وہاں کے اہل علم و فضل مشاہیر سے جو اقبالی

جوہر کے صحیح جوہری تھے جیسے عماد الملک سید حسین بلگرامی۔ نواب نظامت یار جنگ (انگریزی کا مشہور فلسفی شاعر) نواب سرامین جنگ۔ مسز نائیڈو۔ ان میں سے کسی سے کسی صحبت یا ملاقات کا بیان نہیں ہے۔

علامہ اقبال اور شاہان افغانستان

علامہ کی زندگی میں افغانستان کے بادشاہوں سے تعلقات کی بھی دلچسپ داستان ہے۔

اس کی ابتدا ۱۹۲۳ء سے ہوتی ہے جب کہ علامہ نے اپنی بے نظیر نظموں کا مجموعہ "پیام مشرق" امیر امان اللہ خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کا عنوان ہے۔

"بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں فرمانروائے دولت
مستقلہ افغانستان خلد اللہ ملکہٗ و اجلالہٗ"

تمہید میں کافی اشعار ہیں جن میں عام مدحیہ قصائد کے طرز پر مدح، تعلّی، تشبیب اور گردش کا شکوہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اے امیر کامگار اے شہریار	نوجوان و مثلِ پیران پختہ کار
چشم تو از پردگی ہا محرم است	دل میانِ سینہ اَت جامِ جم است
عزم تو پایندہ چوں کہسار تو	حزم تو آساں کند دشوار تو
ہمت تو چوں خیال من بلند	ملّتِ صد پارہ را شیرازہ بند
ہدیہ از شاہنشہاں داری بسے	لعل و یاقوتِ گراں داری بسے

اے امیر ابنِ امیر ابنِ امیر
ہدیۂ از بے نوائے ہم بپذیر

تا مرا رمزِ حیات آموختند	آتشے در پیکرم افروختند

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام   عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

آگے چل کر شاعر المانوی گوئٹے کے ساتھ اپنا مقابلہ و موازنہ کر کے اپنی نسبت کہتے ہیں :-

حق رموز مملکت بر من کشود   نقش غیر از پردۂ چشمم ربود

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند   در دیار ہند خوارم کردہ اند

لالہ و گل از نوایم بے نصیب   طائرم در گلستانِ خود غریب

بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است

وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

پھر مسلم ممالک عرب، مصر، ترکی اور ایران کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے مسلمانان ہند کی نسبت کہا کہ

مسلم ہندی شکم را بندۂ

خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

اس کے بعد نہایت دلنشین پیرایہ میں آئین صدیق رضؓ و عمر رضؓ کی یاد تازہ کرنے اور ملت افاغنہ کی تہذیب میں ترقی کی کوشش اور تعلیم پر متوجہ کیا ہے۔

مگر کسی سیرت نگار نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ہدیہ کس طرح پیش اور قبول ہوا اور اس امیر ابن امیر نے اپنی منت پذیری یا قبولیت کا کس نہج سے اظہار کیا۔

ہماری اطلاع یہ ہے کہ علامہ نے یہ پیشکش ایک ایسے شخص کے ذریعہ سے کی تھی جو لاہور کا باشندہ تھا اور امان اللہ خاں کے دائرہ تحریرات میں ایک مترجم اور جاسوس تھا۔

جب کتاب پیش ہوئی تو رائے کے لئے افسر تعلیمات کے پاس بھیجی گئی انھوں نے مقررہ قاعدہ کے مطابق ایک کمیٹی بناکر اس کے سامنے پیش کی۔

کمیٹی کے ارکان نے کبھی اقبال کا نام بھی نہ سُنا تھا اور نہ وہاں کے کسی اخبار میں ان کی کوئی نظم شائع ہوئی تھی اور اُن ارکان میں سے اُردو تو کوئی جانتا ہی نہ تھا، اس سے قبل کوئی فارسی کی دوسری کتاب بھی وہاں نہ پہونچی تھی، تاہم اس نظریہ کے تحت کہ مشاہیر ہند سے ربط ضبط رکھنا اور مسلم ہندی کے دل پر اپنا اثر ڈالنا بھی سیاسی نظریات و تصورات کے تحت ضروری تھا اور چوں کہ تمہیدی اشعار میں حسن طلب کا پرتو تھا اس لئے غور کرتے وقت کمیٹی نے طے کیا کہ اگر امیر کی طرف سے کسی ہندوستانی کو انعام یا عطیہ دیا جائے تو افغانستان کی خدمات کا لحاظ ہونا چاہیئے اور اس خیال سے اس کا پہلا استحقاق مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو پہنچتا ہے جنھوں نے افغانستان کی حمایت میں ہمیشہ آواز بلند کی ہے، اقبال تو انگریزوں کے خطاب یافتہ ہیں۔ اور ان کی کوئی خدمت بھی نہیں ہے۔

غرض اس پیش کش کا انجام یہ ہوا۔[۱]

علامہ کی اس مثنوی میں مدحت، تعلی، شکوہ افلاک اور قسمت کی شکایت سب ہی کچھ موجود ہے جو عموماً درباری شعرا کے قصائد میں پایا جاتا ہے لیکن یہ مصرعہ:-

---

[۱] اقتباس خط مولوی محمد حسین خاں ایم اے دعلیگ، جالندھری سابق ڈائرکٹر تعلیمات افغانستان۔

در دیارِ ہند خوارم کردہ اند

واقعیت وصحت سے بعید اور خود ان کی شان سے گرا ہوا ہے۔

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی تعلیم اور اُن کے ہنر کی سرمایہ داری کی مناسبت سے علی گڑھ حیدرآباد دکن اور خود اپنے مستقر لاہور میں پروفیسری پیش کی گئی اور حکومت پنجاب نے تو ساتھ ساتھ پریکٹس کی آسانی کا بھی انتظام کر دیا تھا۔

ایک سیرت نگار ناقل ہیں کہ حکومت نے انڈین ایجوکیشنل سروس میں وہ اعلیٰ عہدہ پیش کیا جو اب تک کسی ہندوستانی کو نصیب نہ ہوا تھا مگر اقبال نے انکار کر دیا۔ جس پر مسٹر جسٹس شاہ دین کا مشورہ تھا کہ اس سے انکار نہ کریں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ تعلیمی لائن میں اقبال کی قابلیت سے ملک کو بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔

حیدرآباد، علی گڑھ اور میسور میں ان کو لیکچروں کے لئے دعوت دی گئی اور ان لیکچروں سے استفادے کئے گئے، ان کو اسلامیہ کالج کا معتمد منتخب کیا گیا۔ اور جس سال یہ پیشکش ہوئی ہے۔ اسی کی یکم جنوری نوروز کو حکومت کا سب سے بڑا خطاب دستار جو مخصوص اعلیٰ مرتبہ کے ہندوستانیوں کو ملتا تھا حاصل ہوا اس لئے

در دیار ہند خوارم کردہ اند

کسی طرح صحیح نہیں نظر آتا۔

مثنوی کا یہ شعر کہ:۔

مسلم ہندی شکم را بندہٴ\
خود فروشے دل ز دیں بر کندہٴ

مسلمانان ہند کی انتہائی تذلیل پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم سے گذشتہ پندرہ سال ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۲ء کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلم ہندی نے قومی نشاۃ ثانیہ میں کس قدر جدو جہد کی، مالی امداد کی اور سرفروشانہ خدمات انجام دیں۔

مسلم لیگ کی تاسیس سے اپنی قومی سیاسی پوزیشن کی حفاظت و مضبوطی مسلم یونیورسٹی کے قیام سے تعلیمی ترقی، تقسیم بنگال کی تنسیخ سے ایک عام لہر کا پیدا ہونا، طرابلس و بلقان کے مظلوموں سے ہمدردی اور اُن کی امداد، اور خلافت کے بقا کی کوشش میں مالی ایثار اور صعوبات کا تحمل اسی زمانہ کی تاریخ ہے، ہجرت کا آغاز بھی انہی ایام میں ہوا مسلمانوں نے افغانستان کو ملجا و ماوا قرار دیکر ادھر کا رُخ کیا مگر وہاں اِس "امیر ابن امیر" نے ہندوستانی مسلمانوں پر کابل کا دروازہ ہی بند کر دیا اور ہزار ہا مسلمان دشوار گزار راہوں میں طعمۂ زاغ و زغن بنے، پھر اسی سال مسلمان، اقبال کی قدر شناسی کا عملی ثبوت "اقبال فنڈ" قایم کرکے دینا چاہتے تھے جس کی نسبت خود ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اقبال فنڈ قائم کرنا میری رائے میں جس میں میرے ضمیر کی آواز بھی شامل ہے درست نہیں، مسلمان غریب قوم ہیں اور باوجود اپنی غریبی کے گذشتہ دس بارہ سال میں ایک کروڑ سے زیادہ چندوں میں دے چکے ہیں"

(۲۵ جون ۱۹۲۳ء موسومہ خان نیاز محمد خاں)

امان اللہ خاں کو ہندوستان اور خاص کر اس ملک کے مسلمانوں سے نفرت تھی[1] ممکن ہے کہ علامہ نے مسلم ہندی کو بندۂ شکم، خود فروش اور دین

[1] بحوالہ خط مولوی محمد حسین خاں سابق وزیر تعلیم افغانستان۔

سے متنفر بتا کر امان اللہ خاں کے دل کو خوش کرنا چاہا ہو۔

بہرحال یہی ہدیہ تعلقات کی پہلی کڑی تھا۔ اس کے بعد ایک سیرت نگار لکھتے ہیں کہ:۔

"بچہ سقہ اور ملائے شور بازار کی ہڑبونگ نے افغانستان کے تاجدار امان اللہ خاں کو تخت افغانستان سے کنارہ کشی پر مجبور کر دیا تو نادر خاں نے جو پیرس میں مقیم تھے اس ملاگردی کو دور کرنے اور تباہی کے دلدل میں گرفتار افغانستان کو نجات دلانے کے لئے افغانستان کا عزم کیا تو اُن کو خدا حافظ کہنے کے لئے لاہور کے اسٹیشن پر اقبال بھی موجود تھے۔ گاڑی روانہ ہونے سے کچھ پہلے اقبال نے اُن سے تخلیہ میں کہا کہ تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو، میں ایک فقیر آدمی ہوں، نیک تمناؤں اور دعاؤں سے ہی تمہاری خدمت کر سکتا ہوں اتفاق سے پانچ ہزار کی رقم میرے ساتھ ہے اگر تمہارے کام آ سکے تو مجھ کو بڑی خوشی ہو گی نادر خاں نے جو چشم پُر آب تھے فقیر کی اس دین کو بڑا ہی نیک شگون سمجھا اور بڑے احترام سے اس ہدیہ کو قبول کیا۔" (کہانی صفحہ ۹۵)

اس واقعہ کے متعلق مکاتیب ص۲۰۷ پر درج ہے کہ:۔

"عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جب نادر خاں لاہور سے گزرے تو اقبال اپنا تمام اندوختہ جو اس وقت اُن کے پاس موجود تھا لیکر اسٹیشن پر پہنچے اور علیحدگی میں نادر خاں سے کہا کہ میری کائنات یہی کچھ ہے اسے قبول فرما کر اس جہاد کے ثواب

اور افغانستان کے استقلال کی کوشش میں شمولیت کا شرف
مجھے حاصل ہونے دیجیئے نادر خاں نے متاع درویش کے
قبول سے بصد شکریہ انکار کر دیا۔"

ان مندرجات کو پڑھتے وقت یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ :-
تخلیہ کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں گاڑی کے اندر صرف باتھ روم اور
پلیٹ فارم پر ویٹنگ روم لیکن نادر خاں کے ہمراہی ایک ایسے شخص کے
ساتھ جو امان اللہ خاں کا مداح رہا تھا خلوت میں جانے کی اجازت شاید
کسی ہیچ نہ دیتے اور حالات کے لحاظ سے مقتضائے احتیاط بھی یہی تھا،
دوسرے یہ کہ خلوت کی ملاقات سیاسی غلط فہمیوں کا بھی باعث تھی، تو فرضاً
ایسی ملاقات ہوئی بھی تو رقم کے لینے یا مسترد کرنے اور جو گفتگو ہوئی اس کے
بیان کرنے کا کوئی راوی بھی تو ہو، مزید برآں کہانی والے صاحب کو "چشم
پُر آب" کیوں کر نظر آئی ؟

کسی روایت کی اس سے زیادہ بے سروپائی کیا ہو سکتی ہے ؟
اس کے راوی یا تو علامہ ہو سکتے تھے یا خود نادر خاں نگران کا حوالہ
نہیں، پھر اقبال اور اندوختہ، بمشکل بھی قیاس میں نہیں آسکتا۔ اور اگر
تھا بھی تو اس تمنا کے برلانے میں صرف کیا گیا ہوتا جو زیارتِ گنبدِ خضریٰ
کی عرصہ سے دل میں پرورش پا رہی تھی !!

البتہ ۱۹۲۹ء میں افغانستان کی امداد و استقلال کے لئے ایک
فنڈ کھولا تھا اور اس میں امداد کی درخواستیں بھی کی تھیں اس کے متعلق
سیرت نگار خاموش ہیں مگر مکاتیب میں مسٹر جمیل بنگلوری کے نام علامہ
کا جو خط ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے یہ فنڈ قائم کیا لکھتے ہیں

کہ :-

"مجھے امید ہے کہ احباب بنگلور جن سے میں نے اس سلسلہ میں اعانت
کی درخواست کی ہے فراخدلی سے چندہ دیں گے، میں نے
سیٹھ حاجی اسمٰعیل ایڈیٹر الکلام اور عبدالغفور صاحب کو بھی تار
دیا ہے۔ براہ کرم ہمارے اٹک پار بھائیوں کی طرف سے جو ذمہ داری
ہم پر عائد ہوتی ہے وہ ان حضرت کو یاد دلائیے، افغانستان
کا استقلال واستحکام مسلمانانِ ہندوستان اور وسطی ایشیا کے
لئے وجہ جمعیّت وتقویت ہے، بچّہ سقہ اپنے گیارہ ساتھیوں
سمیت قتل ہو چکا ہے اور نادر خاں بادشاہ بتدریج استحکام
حاصل کر رہے ہیں۔"

علّامہ کی اس اپیل اور جد وجہد کا کیا نتیجہ نکلا، کس قدر فنڈ جمع ہوا، اور کس طرح
استعمال کیا گیا اور کب تک جاری رہا یہ سب عالم خفا میں ہے، علامہ کی
زندگی میں یہ بڑا واقعہ ہے کہ وہ کسی فنڈ کے جمع کرنے پر آمادہ ہوئے،
اس لئے اس کو تو تفصیل کے ساتھ سیرت نگاروں کو دکھانا چاہیئے تھا۔
جس سے اُن کے عزم اور پبلک پر اثر کی حالت کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا
تعجب ہے کہ بنگلور جو لاہور سے ہزاروں میل دُور ہے وہاں علامہ اپنے
احباب سے درخواست کرتے ہیں لیکن پنجاب کو نظر انداز کر جاتے ہیں،
کیونکہ یہاں ایسی تحریک کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور یہ کہ علامہ نے خود اس فنڈ
میں کتنی رقم عنایت کی۔

کہانی کے مصنف رقمطراز ہیں کہ :-

"نادر خاں نے افغانستان پہونچ کر بہت جلد اپنے بلند منصوبوں

میں کامیابی حاصل کی اور نادر شاہ کے لقب سے تخت افغانستان
پر متمکن ہونے کے بعد اقبال سے افغانستان آنے کی درخواست
کی، اقبال نادر خاں کی درخواست پر راس مسعود کے ساتھ
افغانستان پہنچے نادر نے اقبال کا جو پُر تپاک خیر مقدم کیا ہے
وہ افغانستان کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے، نادر نے
ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ افغانستان کا تخت فقیر اقبال ہی کا تحفہ
ہے، پہلی ملاقات میں مغرب کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے
اقبال سے امامت کی درخواست کی اقبال نے کہا کہ نادر
میں نے اپنی پوری عمر کسی شاہِ عادل کی اقتدا میں نماز کی
تمنا میں گذاری ہے۔ آج جبکہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے
پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت
سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں
گا امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔ نادر نے فقیر کے اس حکم کی تعمیل میں
امامت کی، نادر سسکیاں لے رہے تھے اور اقبال اشکبار
تھے۔ ان میں ایک امیر بہ سلطانی فقیرے کی مثال بنا ہوا
تھا تو دوسرا "فقیر او بہ درویشی امیرے" کا مکمل نمونہ،
خدائے واحد کے آگے دونوں کے سر سجدے میں تھے اور
پوری کائنات سجدہ کناں ان کا طواف کر رہی تھی"

(کہانی صفحہ ۹۶، ۹۷)

افسوس کہ اقبال کے پرتپاک استقبال کا تاریخی باب ایک نامکمل جملہ میں
ختم ہے، اور تخت ملنے کے بعد احسان مندی کے احساس کا تو پتہ ہی نہیں۔

افغانستان جانے کا واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے افغانستان کی تعلیمی اصلاح و ترقی میں مشورہ حاصل کرنے کے لئے سر سید راس مسعود، مولوی سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کو مدعو کیا تھا۔ چنانچہ سید راس مسعود اور علامہ اقبال ساتھ ساتھ اور ندوی صاحب دو تین روز بعد کابل پہنچے، مہمانوں کے لئے سفر کی راحت و آرام کا ہر منزل پر بدرجہ غائت اہتمام تھا اور نمائندگان حکومت مدارات کے لئے موجود تھے۔ کابل پہنچنے پر اقبال کے پُرتپاک استقبال کی انفرادی خصوصیت کوئی نہ تھی۔ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ تھا، وزرا و امرا نے بھی سب ہی کی مشترکہ دعوتیں کیں۔ نادر شاہ نے بھی تینوں مہمانوں سے ملاقاتیں کیں، جمعہ کے دن مسجد میں شاہی مقصورہ کے اندر مہمان بھی شریک نماز تھے۔

مولوی سید سلیمان نے ۱۹۳۴ء میں اس سفر کے حالات "معارف" میں مسلسل شائع کئے، اور اقبال نے بھی نادر شاہ کی شہادت کے بعد ایک مثنوی "مسافر" کے نام سے شائع کی اس میں ایک عنوان

"مسافر وارد می شود بہ شہر کابل و حاضر می شود بحضور اعلیحضرت شہید"

قائم کر کے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے اول کے چند اشعار میں کابل اور قصر دلکشا میں نادر کی تعریف کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر ہے:-

شاہ را دیدم دراں کاخ بلند	پیش سلطانے فقیرے دردمند
در حضور آں مسلمانِ کریم	ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم ایں سرمایۂ اہل حق است	در ضمیر او حیاتِ مطلق است

اندر و ہر ابتدا را انتہا است　　حیدر از نیروئے او خیبر کشا ست

نشۂ حرفم بخون او دوید
دانہ دانہ اشک از چشمش چکید

پھر نادر شاہ کا جواب ہے جس کا آخر یہ ہے کہ:۔

غیر قرآن غمگسار من نبود
قوتش ہر باب را بر من کشود

اس کے بعد خاتمۂ ملاقات یہ ہے کہ:۔

گفتگوئے خسروِ والا نژاد　　باز با من جذبۂ سرشار داد
وقت عصر آمد صدائے الصلوٰۃ　　آں کہ مومن را کند پاک از جہات
انتہائے عاشقاں سوز و گداز　　کردم اندر اقتدائے او نماز

رازہائے آں قیام و آں قعود
جز بہ بزم محرماں نتواں کشود

اس مہمانی میں علامہ کے ساتھ کسی نا بہ الامتیاز برتاؤ کا اور نہ اس "ہدیۂ فقیر" کے تشکر کا کوئی اشارہ و نشان ہے جو کہانی میں مذکور ہے۔ نادر نے ان مہمانوں کو جو تحائف دئے وہ بھی یکساں مالیت کے تھے۔

علامہ نے اس مثنوی میں نادر شاہ کے جانشین کو بھی خطاب کیا ہے کہ:۔

"خطاب بہ بادشاہ اسلام اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ ایدّ اللہ بنصرہ"

اس میں ظاہر شاہ کی تعریف اور اپنی للّٰہیت اور اپنے مقام معرفت کو بیان کرتے ہوئے دعوت دی ہے کہ

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام　　تا درخشی مثل تیغِ بے نیام

نادر شاہ کی شہادت کے بعد یہ مثنوی علیحدہ طبع کرائی گئی جس سے قرین قیاس ہے کہ وہ ظاہر شاہ کو بھیجی گئی ہوگی مگر اس کے متعلق بھی سیرت نگاروں نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ یہ بھی تعجبات سے ہے کہ علامہ کے قلم سے

"بادشاہِ اسلام"

لکھا گیا، اسلام کا تو کوئی بادشاہ نہیں!! سوائے تاجدار مدینہ صلعم کے۔

سیّد راس مسعود سے تعلّقات اور وظیفۂ بھوپال

سر سید راس مسعود سے جو اصحاب واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ان میں دل و دماغ کی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو اُن کے جدِّ امجد سر سیّد احمد خاں اور والد ماجد سیّد محمود میں تھیں۔

پر جوش، ہمدرد، فیاض، قدر شناس علم و ادب سے شوق و مناسبت رافت و شفقت اور ہر وقت دوسروں کی مدد کے لئے آمادگی، دل بے کینہ و صاف، ان کی مخصوص صفات تھیں۔

سخن گو نہ تھے مگر سخن سنج تھے، ہر قوم کے مشاہیر علم و فن سے رابطہ تھا، ادیبوں اور شاعروں سے دلچسپی تھی۔ اس صورت میں کیوں کر ممکن تھا کہ علامہ اقبال کی عظمت و قدر اُن کے دل میں نہ ہو مگر چوں کہ وہ یورپ سے ختم تعلیم کے بعد جارہی بنگال ایجوکیشنل سروس سے متعلق ہوگئے اور پھر حیدر آباد دکن میں ان کی خدمات منتقل ہوگئیں اس لئے شمالی ہند اور پنجاب سے دور رہے اور علامہ اقبال سے روابط خصوصی نہ ہوئے لیکن حیدر آباد سے سبکدوشی کے بعد جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو ۱۹۳۰ء میں انھوں نے علامہ اقبال کو خصوصی لکچروں کے

لئے مدعو کیا چنانچہ علامہ نے چند دن ان کے مہمان رہ کر چند نہایت عالمانہ لکچر دیئے۔ یونیورسٹی میں ایسے لکچروں کا معاوضہ ایک مقررہ شرح سے دیا جاتا تھا مگر سید راس مسعود نے اس شرح کا معیار کم سمجھا اور وائس چانسلر فنڈ سے زیادہ شرح پر معاوضہ دیا۔ یہ مراعات خصوصی تھیں۔ علامہ نے اپنے علی گڑھ جانے اور وہاں کے ماحول کے متعلق مولوی عبدالماجد کو ایک خط میں لکھا کہ:۔

"وہاں نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے اور سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" (۲۹ جنوری ۱۹۳۰ء)

اب خاص مراسم کا آغاز ہوا تھوڑی مدت بعد ہی دونوں دعوت افغانستان پر کابل گئے، ہم سفری کے علاوہ کئی دن تک شبانہ روز یک جائی رہی اور اس طرح روابط میں جذبہ و جوش کا اضافہ ہوا۔

۱۹۳۴ء میں سر سید راس مسعود وائس چانسلر شپ سے مستعفی ہونے کے بعد بھوپال میں وزارت تعلیم کے عہدہ پر مقرر ہوئے تو ۲ جون کو علامہ نے ان سے ملنے اور ایک ذاتی مشورہ لینے کے لئے اُن سے پتہ اور پروگرام دریافت کیا چنانچہ جواب کے بعد علامہ مارچ ۱۹۳۵ء میں بھوپال گئے اور واپسی کے بعد سلسلۂ مراسلت شروع ہوا۔

اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید راس مسعود نے علامہ کے متعلق حیدرآباد دکن اور بہاولپور میں کوئی خاص کوشش کی تھی مگر علامہ کو ان دونوں جگہوں سے مایوسی تھی، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک خط میں سید راس مسعود کو لکھا کہ:۔

"آپ نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اسکے

لئے آپ کا ممنون ہوں اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کچھ
تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلہ میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں
مجھے کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کے اس
کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے
لئے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی
روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں
لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب
شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں
وقف کر دینے کا سامان میسر آوے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن
کریم کے ان نوٹوں سے بہتر کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔
بہر حال دیدہ باید ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے
اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے
لئے مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لئے
ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔" (۲۲ اپریل ۱۹۳۵ء)

پھر ۲۳ مئی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میری خواہش تو حقیقت میں اس انسان کی خواہش ہے
جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور سفر آخرت سے پہلے کچھ
نہ کچھ خدمت انجام دینے کا تمنائی ہے مجھے امید ہے کہ آپ
اعلیٰ حضرت کی خدمت اقدس میں اس مسئلہ کو پیش کریں گے"۔

پھر ۳۰ مئی کو ایک اور خط لکھا کہ :۔

"چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں"

تمنّا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں، جو تھوڑی سی ہمت اور طاقت مجھ میں ابھی باقی ہے اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد (حضور نبی کریم صلعم) کی زیارت مجھے بھی اطمینان خاطر کے ساتھ میسّر ہو کہ عظیم الشان دین کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجالا سکا۔"

در اصل یہ مقصد و شرف ایسا تھا کہ جس کے دل میں اسلام کی خدمت کا جذبہ ہوتا وہ اس کے لئے امکانی جدوجہد سے آمادہ ہو جاتا۔ بھوپال کی فرماں روا بیگمات نے اور بالخصوص نواب سلطان جہاں بیگم فردوس آشیاں نے جو اسلامی خدمات کی ہیں وہ تاریخی افتخار رکھتی ہیں۔

فردوس آشیاں نے اپنی والدہ خلد مکان نواب شاہجہاں بیگم کی تعمیر کرائی ہوئی ووکنگ مسجد انگلستان کو اسلامی مرکز بنانے میں خواجہ کمال الدین مرحوم کی جو امداد کی اور سیرت نبوی صلعم کی تالیف میں مولانا شبلی اور دار المصنفین کو جو سرمایہ بہم پہنچایا وہ مشہور و معروف ہے۔

ہز ہائینس حاجی محمد حمید اللہ خاں کے دل میں قدرتی طور پر مذہب کا جوش و جذبہ تھا اور ان کی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ وہ زمانہ حاضرہ کے افکار کی روشنی میں اس مقصد کی اہمیت سمجھتے تھے۔ خواجہ صاحب سے ملاقاتوں میں یہ مسئلہ موضوع گفتگو رہتا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کی امداد میں مسند آرائے سیاست ہونے سے قبل ہی مالی امداد کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اب کہ سر سید اس مسعود نے یہ مسئلہ حضور ممدوح کے سامنے پیش کیا تو قدرتی طور پر کامیابی

پر کامیابی پیش پیش تھی۔

چنانچہ ۳۰ مئی کا خط پہونچنے سے پہلے ہی اعلیٰ حضرت نے علامہ کے ارادہ کی تکمیل کا ذریعہ بہم پہونچا دیا، یعنی پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر کے "قاتل روح فکر روزی" سے نجات دیدی، اور ۲۷ مئی کو سر سید راس مسعود نے علامہ کو حسب ذیل خط لکھا[۱]:-

"میرے پیارے اور بہت پیارے اقبال!

میں نے کل مبارکباد کا ایک تار بھیجا تھا جب کہ چند گھنٹہ بعد ہی آپ کے خط سے آپ کی بیگم کے انتقال کی الم انگیز خبر معلوم ہوئی اور فوراً دوسرا تار اس سانحہ میں ہمدردی کا روانہ کرنا پڑا۔ ہم دونوں[۲] کو دلی رنج ہے اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اس صدمہ کے برداشت کی طاقت اور صبر عطا کرے۔

مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بہت اطمینان ہے کہ ہز ہائنس فرمانروائے بھوپال نے اپنے ذاتی تعلق سے جو آپ کے ساتھ ہے اور خدمت اسلام کی غرض سے بہ الطاف خسروانہ پانچ سو روپیہ ماہوار کی تاحیات پنشن مقرر کی ہے اور یہ پنشن ہز ہائینس کے صرف خاص سے جاری ہوگی جو باوجود ان مالی مشکلات کے ہے جس میں کہ ہم بھی سنٹرل انڈیا کی طرح مبتلا ہیں اور یہ پنشن یکم جون ۱۹۳۵ء سے جاری ہوگی گویا آئندہ ماہ یکم سے۔

ہز ہائینس کی بڑی خواہش ہے کہ آپ قرآن کریم کی اس تفسیر پر

---

[۱] اصل خط انگریزی میں ہے [۲] مسعود و لیڈی مسعود

کام شروع کریں جس کے متعلق آپ کا ارادہ ہے جو ملک تو آپکی رہے گی اور جو منافع اس کی فروخت سے ہوگا وہ ہمیشہ آپ کو اور آپکی اولاد کو ملتا رہے گا۔ لیکن آپ کو یا تو ٹائیٹل پیج پر یا اندر دیباچہ میں صاف اور واضح الفاظ میں اس کتاب کا تعلق بھوپال کے موجودہ روشن دماغ فرمانروا سے دکھانا ضروری ہے کہ جنھوں نے ذاتی طور پر یہ ممکن کر دیا کہ آپ اس کتاب کو لکھ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کو ان کے نام سے معنون کر دیں اور عام رواج کے مطابق اس میں یہ ظاہر کر دیں کہ اگر ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ کتاب دن کی روشنی نہ دیکھتی۔ براہ کرم مجھے اس خط کا جواب جلد دیجیے کہ میں جلد از جلد ماہوار اجرائے پنشن پر ضروری احکام جاری کروادوں آخر میں یہ اضافہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ امر آپ کو بتا دوں کہ ہز ہائینس ایک اور ذریعہ سے بھی آپ کے لئے ماہوار آمدنی کی کوشش کر رہے ہیں۔"

علامہ نے ہمروزہ جواب لکھا (۳۰ر مئی ۱۹۳۵ء)

"ڈیر مسعود آپ کا والا نامہ بھی ملا ہے میں کس زبان سے اعلیٰحضرت کا شکریہ ادا کروں انھوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جبکہ میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا" خداوند تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے تمام مسلمان نشرفا میں سے کون ہے جو اعلیٰحضرت کا اور ان کے دودمان عالی کا ممنون احسان نہیں ہے[1]

---

[1] مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اول میں راس مسعود کے موسومہ خطوط منقول ہیں لیکن ان میں تحریف ہے۔

دور دستاں را بہ احسان یاد کردن ہمت ست
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

یہ عریضہ اعلیٰ حضرت کو سُنا دیجیے۔

"اب میری درخواست صرف اس قدر ہے کہ احکام اس پنشن کے تو جاری ہوں گے سرکار عالی اپنے ہاتھ سے بھی اسی مضمون کا ایک خط مجھے لکھ دیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے۔ یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار رہے گا۔ اور وہ اس پر فخر کریں گے۔"[1]

سر راس مسعود نے جواب میں لکھا کہ:۔

"جب خدمت میں حاضر ہوں گا تو جو مضمون چاہیے ہو ان کے ہاتھ سے لکھوا کر انشاء اللہ تمھارے پاس روانہ کر دوں گا تاکہ تمھارے خاندان میں جاوید سلمہٗ کے پاس بطور یادگار محفوظ رہے۔
مجھے اس کی پوری امید ہے کہ تمہارے لئے جو مزید کوشش اس وقت سرکار کر رہے اس میں بھی کامیابی ہوگی۔"

(۴ جون ۱۹۳۵ء)

سرکار نے ہز ہائینس آغا خاں کو خط لکھا تھا کہ خود بھی اقبال کا وظیفہ مقرر اور دیگر والیان ریاست سے بھی امداد کرائیں۔ اس طرح اقبال وظیفہ پول قایم کیا جائے۔ ہنوز یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ ہز ہائی نس نے سر راس مسعود

---

[1] اس موقع پر علامہ کے یہ پر جوش اشعار یاد آتے ہیں:۔
فطرت کو پر فلک بند و نظر
پست می گردد ز احسان دگر

کو توجہ دلاتے پر خود ہی وظیفہ مقرر کر دیا اور علامہ کی خواہش کے مطابق ہز ہائینس سے خط لکھوا کر بھی بھیج دیا اس کے جواب میں علامہ نے اطلاع دی کہ[1]

"میں نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوا دیا ہے۔"

علامہ نے یہ درخواست بھی کی کہ:-

"اخباروں میں اس کا چرچا مناسب معلوم نہیں ہوتا اور اس کی ادائیگی بھی معرفت اعلیٰ حضرت ہونی چاہیے۔"

(۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء)

اخبارات میں چرچا نہ ہونے کا مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ اس امداد کی شہرت نہ ہو لیکن طریقہ ادائیگی کی یہ خواہش بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ ہز ہائینس آغا خاں کے وظیفہ کے متعلق علامہ کی خواہش تھی کہ:-

"جاوید کے نام تا ختم تعلیم ہو جاوے۔"

چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ نے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء کو ایک مفصل خط لکھا تھا کہ:-

"کل خط لکھ چکا ہوں آج اس تمام معاملہ پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں آپ اس خط کو کانفیڈنشل تصور فرمائیں۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھوپال میں آپ کے بڈ روم میں گفتگو کی تھی میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کرنے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ کر دیا ہوگا۔ اس کے بعد جس

---

[1] یہ بیان ممنون حسن خان صاحب کا ہے جو سید راس مسعود کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔

آبروئے ملت بیضا مریز   نعمت از حق خواہ و از سلطان مخواہ

مسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی "ٰ
معاملہ ہے۔ بہر حال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب
بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے
کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں
بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے،
ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح
بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے آپ کو میرے اس خط
سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں
اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا طرز ہے اُن کا شیوہ ہمیشہ سادگی
اور قناعت رہا ہے اِن حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس
رقم مزید کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور میں بعید تذبذب
کی حالت میں ہوں مجھے نہیں معلوم کہ آپ سے اور ہز ہائینس
آغا خاں سے کیا خط و کتابت ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے
کہ میری اس تحریر کو ناشکری پر محمول نہ کیا جائے بہر حال میں
نے ہز ہائینس آغا خاں کو شکریہ کا خط لکھ دیا ہے گو اس میں
مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مطلق نہیں کیا گیا اور اخلاقاً مجھ کو
ایسا کرنے کی جرأت بھی نہ کرنی چاہیئے تھی۔ آپ جب اس معاملہ
پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت سے پہلو
ہیں اور میں نے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر آپ
کو یہ خط لکھا ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھ کو جلد اس امر
سے اطلاع دیں کہ آیا آپ کو میرے ان خیالات سے

اتفاق ہے یا نہیں اگر اتفاق نہیں ہے اور اب اس تجویز
کا ڈراپ قرین مصلحت نہیں ہے تو پھر میں ایک اور تجویز
پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائینس آغا خاں یہ پنشن جاوید
کو عطا کر دیں اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے
یا جس وقت تک کہ ہز ہائینس مناسب تصور کریں۔ بعض پرائیویٹ
وجوہ کی بناء پر جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو معلوم بھی
ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بہ کلّی
اطمینان ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہز ہائی نس آغا خاں
میری اس تجویز کی نسبت کیا خیال کریں گے۔ میں نے اپنی
مشکلات کا حال آپ کو لکھدیا ہے اب آپ جو تجویز چاہیں
کریں اور مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کریں۔ جہاں تک
ممکن ہے جلد۔ آخری فیصلہ تک اس بات کا پریس میں جانا
مناسب نہیں ہے امید ہے مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

علامہ نے جو شکریہ کا خط ہز ہائینس نواب صاحب کو مورخہ ۳۰ مئی کو
لکھا ہے اس میں مبالغہ حد سے زیادہ کیا ہے کہ ہندوستان کے تمام
خاندان شرفا کو ممنون احسان بنا دیا[1]۔ علامہ نے ہز ہائینس کے قلمی
خط کی جو خواہش کی تھی اس میں ایک قانونی نکتہ مضمر تھا جسکو علامہ

---

[1] اسی طرح کشن پرشاد کو لکھا کہ "آپ کی ذات تو انسان کے لئے چشمۂ فیض و برکات ہے" حالانکہ
علامہ کے لئے نہ بن سکی۔ (۱۶ مئی ۱۹۱۷ء)

کھل کر نہ لکھ سکتے تھے۔ سر راس مسعود ریاست کے ملازم تھے،
ان کو صرف خاص کے متعلق کسی معاہدہ کا حق نہ تھا اور کتاب کاپی رائٹ
ایکٹ کی رو سے نواب صاحب کی ملکیت ہوتی اس لئے نواب صاحب
کے خط سے ملکیت کا سوال ختم ہوتا تھا۔ اقبال نے اپنے کسی خط میں
اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا اس لئے سوانح نگار نذر عقیدت سے تعبیر کرتے ہیں
کہانی والے مصنف فرماتے ہیں کہ :۔

"ایک مرتبہ لاہور جاتے ہوئے راس مسعود سے ملنے کے لئے میں
بھوپال اُتر گیا۔ اتفاق سے اقبال مسعود ہی کے مکان میں
فروکش تھے لیکن بیماری کا اُن پر غلبہ تھا۔ معراج کی شب تھی،
اُن کا مدار المہام امور مذہبی کی حیثیت سے مسجد شاہجہانی میں
منعقدہ تقریب میں شریک ہونا شاید ضروری تھا......

تقریب معراج میں جاتے ہوئے مسعود صاحب نے مجھے بھی اپنے
ساتھ لے لیا۔ ممبر پر فروکش ایک مولانا نے وحی اور ثبوت
کے اسرار کو جس عامیانہ انداز میں پیش کیا۔ میں نے دیکھا کہ
راس مسعود کو اس جہل اور جرأت نے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ وہ
ان مہملات کے سننے کے لئے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گھر واپس آئے تو
اقبال جاگ رہے تھے اور قلبی دورے کی وجہ سے کسی قدر بےچین
تھے......

مزاج پرسی کے لئے ان کے کمرے میں چلے گئے اور ان کا دل بہلانے
کے لئے نہایت ہی دلچسپ اور شیریں انداز میں مولانا کی اس
ہرزہ سرائی کا ذکر کیا۔"

پھر ایک طول طویل داستان ہے۔ ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ علامہ دو مرتبہ بھوپال گئے، پہلی دفعہ راس مسعود کے یہاں مہمان ہوئے اچھے خاصے تھے، دوسری مرتبہ آواز کے برقی علاج کے لئے گئے اور ایک سرکاری محل "شیش محل" میں مقیم ہوئے جو ہاسپٹل کے قریب اور سر سید راس مسعود کی سکونت کوٹھی سے اندازاً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بھوپال میں شب معراج کی کوئی سرکاری تقریب نہیں ہوتی اور مسجد شاہجہانی ایک ناتمام وغیر مکمل عمارت اور غیر آباد محل وقوع پر ہے جہاں رات کو کوئی اجتماع نہ ہوتا تھا البتہ موذن و امام جو متعین تھے نماز پنجگانہ اور قرب وجوار کے مسلمان نماز جمعہ کے لئے اس میں جمع ہو جاتے تھے، اسی طرح رمضان المبارک کی تراویح میں بھی چند ہی آدمی ہوتے تھے، مصنف نے محض ایک واقعہ تصنیف کیا اور لکھ دیا۔

راقم ۳۳ سال مسلسل بھوپال میں مقیم رہا۔ اور ۱۹۳۱ء کے بعد ہر سال جاتا رہا۔ اور ۴۵-۱۹۴۴ء میں نواب صاحب کی لائف مرتب کرنے کی خدمت سپرد ہوئی اور دو سال کے قریب مستقل قیام رہا۔ تقریب شب معراج کبھی سرکاری طور پر نہ سنی نہ دیکھی۔

علی گڑھ اور کشمیر

علی گڑھ تحریک اور علامہ

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کے لئے سر سید نے جو تحریک شروع کی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے زیادہ تر شہرت پذیر ہوئی وہ تعلیمی بھی تھی اور

سیاسی بھی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں بلکہ قدیم تعلیم یافتہ امراء غرباء و متوسط سب ہی کو اس تحریک سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو روز بروز بڑھتی رہی۔

اس تحریک کا مرکز اگرچہ علی گڑھ صوبہ متحدہ تھا مگر سب سے زیادہ پنجاب میں وہ مقبول و موثر تھی۔ سرسیّد کے اعوان و انصار میں بھی مسلمانان پنجاب کا زیادہ حصہ تھا کالج میں بھی پنجابی طلبا کی کثرت تھی اور ان میں اہم طبقہ کے نوجوان تھے مگر بظاہر علامہ کو اس تحریک سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں مسلم یونیورسٹی کی پہلی مرتبہ تحریک لاہور میں ہوئی تھی اس وقت تو وہ طالب علم تھے۔ ۱۹۰۳ء میں سرسیّد کے متعلق ایک نظم ملتی ہے مگر اس کی شانِ فکر کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ البتہ ۱۹۰۶ء میں طلبا کے نام ایک پیغام نظر آتا ہے جس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اس سال یورپین اساتذہ کے خلاف کالج کے طلباء نے اسٹرائک کی اور بعض قدیم طلباء مثلاً مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی تائید سے ان کو بڑی مدد ملی۔ علامہ اس زمانہ میں بغرضِ تعلیم لندن میں تھے اور ان کے استاد یعنی کالج کے سابق پروفیسر مسٹر آرنلڈ بھی وہیں تھے۔ علامہ اور ان کے مابین بھی شاگردی و استادی کا تعلق تھا۔ ایسی حالت اور اس موقع پر ذیل کا "پیام" دیا گیا مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے پاس بھیجا کس اخبار میں شائع ہوا کوئی حوالہ نہیں ہے

اَوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے	عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سُن چکے ہو تم	یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں	کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا	اسکا مقام اور ہے اسکا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاودان ذوق طلب اگر نہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدہ نمود میں شرط دوام اور ہے

آخری شعر یہ تھا:۔

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے منہ پہ تم خشت کلیسیا ابھی

اس پیام کے چھ شعروں میں جو کچھ ہے وہ شاعری یا ایک قسم کا فلسفہ ہے علی گڑھ سے کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ آخری شعر میں یوروپین اسٹاف کی عظمت کا پیام ہے۔

علامہ جب واپس آئے تو علی گڑھ نے پروفیسری پیش کی لیکن انکار کر دیا جس کو عام طور سے ناپسند کیا گیا۔ اسی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک جاری تھی اور برابر ترقی کر رہی تھی لیکن علامہ نے اپنی نظم "جواب شکوہ" میں اس کو صنم بتا کر ناکام ہی تصور کر لیا۔ ع

کشور ہند میں ہے کلیہ ناکام کا بت

۱۹۲۵ء میں ان کو یونیورسٹی میں کسی اعزاز کی تجویز کی گئی تو علامہ نے پروفیسر محمد شریف کو لکھا کہ:۔

"یہ اعزاز اور بھی گرانقدر ہو جاتا ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرا کوئی حق اس یونیورسٹی پر نہ تھا اور نہ عام طور پر علیگڑھ تحریک سے میرا کوئی خاص تعلق رہا ہے۔" (مکاتیب)

پھر سر سید راس مسعود نے اپنے زمانہ میں ۱۹۳۰ء میں لیکچروں کے لئے مدعو کیا اور ۱۹۳۴ء

میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ اس وقت تک کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن
جب وائس چانسلری پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین منتخب ہوئے اور ہز ہائینس نواب صاحب
بھوپال نے چانسلر شپ سے استعفیٰ دیا۔ تو اپنی اور اپنے دیگر احباب کی جانب سے
اورینٹیل پریس میں ایک زوردار بیان شائع کرایا۔ اس زمانے میں بھوپال مرکز
امید و آمال تھا۔

اس علی گڑھ کے سلسلہ میں سوانح نگاروں کی سوانح آفرینی دیکھیے
خلیفہ عبدالحکیم رسالہ نقوش میں لکھتے ہیں کہ:-

علی گڑھ والوں نے کئی مرتبہ ان کو بلایا لیکن وہ ایک دفعہ سے زیادہ
وہاں نہیں گئے[1]۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے بہت اصرار کیا تو ان کو
جواب دیا کہ تم مجھے علیگڑھ بلاتے ہو مجھے یہیں رہنے دو میں یہاں ماللہ گڑھ
میں رہتا ہوں[2]۔ ایک مرتبہ میر عثمان علی خاں علی گڑھ آرہے تھے تو ڈاکٹر
ضیاء الدین کو خیال[3] ہوا کہ اگر اقبال بھی آجائیں اور کچھ اشعار بھی حضور
کی شان میں پڑھ دیں تو زیادہ رقم یونیورسٹی کو مل جائے[4]۔ یہ ان کو تجربہ
ہو چکا تھا کہ خط لکھنے سے اقبال پر کوئی اثر نہیں ہوتا اس لئے ڈاکٹر عطاء اللہ
بٹ پرنسپل طبیہ کالج کو لاہور بھیجا کہ جاؤ وہ ہمارے عزیز بھی ہیں ان کو اصرار
کر کے اپنے ہمراہ لیتے آؤ۔ ڈاکٹر بٹ لاہور میں ہمارے ہاں ٹھیرتے تھے انھوں
نے مجھے ہمراہ لیا اور ہم دونوں اس مہم کو سر کرنے کے لئے ان کے

---

[1] علامہ دو مرتبہ بالمعاوضہ لکچر دینے کو جا چکے تھے [2] یہ جواب ۱۹۱۱ء میں مولانا شوکت علی کو دیا تھا [3] یہ
ایجاد خیالی ہے [4] ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور نظام سے خود گہرے تعلقات تھے۔ پرائیوٹ مراسلت تھی علامہ
اشعار سے کوئی امید نہ تھی کہ زیادہ رقم مل جائے نظام نے جو کچھ عطیات دیئے وہ ڈاکٹر صاحب اور آغا خان
اثر سے اور یونیورسٹی کی ضرورت کے لحاظ سے دیئے۔ (ملاحظہ ہو ضیائے حیات)

پاس حاضر ہوئے۔ علامہ اقبال کچھ معذرت کرنے لگے لیکن ڈاکٹر طبٹ مصر تھے کہ آپکو جانا ہی پڑے گا۔ اقبال ٹالنے کے فن میں ماہر تھے فرمایا کہ تم لوگ چاہو گے کہ میں نظام کی شان میں اور اس تقریب کے سلسلہ میں کچھ اشعار پڑھوں اگر کچھ اشعار ہو گئے تو پھر چلیں گے۔ ڈاکٹر بٹ نے کہا اچھا ہم پھر کل آئینگے دوسرے روز گئے تو فرمانے لگے کہ رات کو میں جلد بستر پر لیٹ گیا اور فکر شعر کرنے لگا کسی آورد یا آمد سے نظام کے متعلق ایک شعر بھی نازل نہیں ہوا اور اس کے بجائے بغیر کسی کوشش کے اور دس بیس اشعار ہو گئے جو اور ہی مضمون کے ہیں غرضکہ دو تین روز اسی طرح ٹالا آخر ڈاکٹر طبٹ مایوس ہو کر علیگڑھ واپس آگئے۔

• میں نے علامہ اقبال سے کہا کہ قومی خدمت ہے چلے چلئے آپ کے لئے شعر کہنا کونسی بڑی بات ہے۔ ریل کے سفر میں حرکت میں برکت پیدا ہو جائے گی، فرمانے لگے خود کچھ شعر کہہ لو اور وہاں جا کر میری طرف سے پڑھ دو۔ میں نے کہا کہ اس نالائق حرکت کا کوئی جواز نہیں"

(نقوش جنوری ۱۹۵۵ء)

اس بیان پر جو ایک قریب ترین شخص کا ہے ناظرین خود ہی رائے قائم کر سکتے ہیں مگر اس کا پس منظر یہ تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین ہر ممتاز وزیٹر کی وزٹ کو اس کے مزاج و میلانات کے مطابق شاندار و دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے نظام بھی شاعر تھے اور ان کے صدر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد بھی اور علامہ اور نظام کی ملاقات بھی ہو چکی تھی اور علامہ مدح بھی کر چکے تھے اور مہاراجہ کے ساتھ تو علامہ کے تعلقات محبوبیت تھے[۱] مگر چونکہ نظام نے ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال کے

---

[۱] خطوط موسومہ مہاراجہ کشن پرشاد ملاحظہ طلب۔

مستعفی ہونے کے بعد چانسلرشپ منظور کی تھی اور کچھ ہی پہلے بھوپال سے علامہ کا وظیفہ مقرر ہوا تھا اس لئے علامہ کو ہز ہائینس کے تکدرِ خاطر کا خیال مانع رہا اور پھر مہاراجہ اور حیدرآباد سے تمام امیدوں میں ناکام بھی ہو چکے تھے اور اس راز کو ظاہر کرنا بھی نہ چاہتے تھے یہ اور زیادہ تعجب انگیز ہے کہ ڈاکٹر بٹ سخت قسم کے کھلے ہوئے قادیانی تھے اور علامہ اقبال قادیانیت کے سخت ترین مخالف۔ ڈاکٹر ضیاءالدین بہت ذہین تھے انھوں نے ڈاکٹر بٹ کو اس کام کے لئے منتخب کرنے میں کیا مصلحت سمجھی ؟ یہ واقعہ بھی مفروضہ معلوم ہوتا ہے۔ راقم خود علی گڑھ میں موجود تھا، ان تدابیر و انتظامات کو قریب سے دیکھتا رہتا تھا یہ خیال بھی نہ تھا کہ علامہ کو مخصوص دعوت دی جائے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ تحریک کا ایسا ادارہ تھا جس نے غیر منقسم ہندوستان مع برما کے مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت کا احساس اور حیاتِ اجتماعی کے فوائد کا خیال اور شعور پیدا کیا۔ سنہ ۱۸۸۶ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک اس کے چونتیس اجلاس ملک کے مختلف مقامات میں منعقد ہو چکے تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء کا اجلاس رنگون میں ہوا تھا۔ غرض بنگال، سندھ، پنجاب، برار، مدراس اور یوپی اودھ سب ہی اس کے دائرہ میں تھے اور اس صدی کے آغاز سے ہی مسلم یونیورسٹی تحریک اس نے اٹھائی اور کامیاب ہوئی۔ بڑے بڑے مشاہیر اور ذی وجاہت اصحاب نے اجلاسوں کی صدارت کی جن میں متعدد اصحاب پنجاب کے تھے۔ اس کے علاوہ ہزارہا غریب مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ رہی اور خود اس کی ایک شاندار عمارت تعمیر ہوئی البتہ سنہ ۱۹۲۱ء میں تعلیمی مقاطعہ کے باعث اس کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا

مگر ۱۹۲۲ء میں جب سکون ہوا تو علی گڑھ میں ہی اجلاس قرار پایا اور سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب صدر منتخب ہوئے۔ اس موقعہ پر بہ لحاظ حالات امید تھی کہ علامہ بھی شریک اجلاس ہوں گے۔ اور اہم تعلیمی مسائل اور بالخصوص تعلیمی مقاطعہ پر اظہار خیالات کریں گے لیکن وہ شریک نہ ہوئے اور وجہ جو تھی وہ ان ہی کے قلم سے یہ تھی کہ:۔

"افسوس ہے کہ میں علی گڑھ نہ جا سکوں گا۔ سردی کا موسم ہے اور مجھے اس موسم میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ کانفرنس ایک عرصہ سے مر چکی ہے۔ حبیب الرحمن خاں شروانی اس کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر

پئے نافہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او گرہے زن و بہ ختن درآ

(۱۶ دسمبر ۱۹۲۲ء مکاتیب اقبال)

لیکن یہ علامہ کا خیال ہی خیال تھا اور عرصہ کا لفظ محض تراوش قلم تھی وہ اتنی زندہ قوت تھی کہ ۱۹۲۴ء میں قائد اعظم نے بمبئی میں سالانہ اجلاس کے لئے مدعو کیا اور سالانہ اجلاسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۸ء کے اجلاس منعقدہ مدراس کے صدر علامہ کے مخلص ترین دوست سر عبدالقادر تھے انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں سر سید اور ان کے جانشینوں کی مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"گذشتہ چالیس سال میں جس قدر بھی بڑے آدمی مسلمانانِ ہند میں ہوئے یا جنھوں نے اچھی خدماتِ قومی انجام دیں انھیں بالعموم اس کانفرنس سے کچھ نہ کچھ تعلق

رہا ہے۔"

پھر سٹر دانی صاحب کی نسبت کہا کہ :۔

" انہیں کی کوشش سے وہ روایات جو اس کانفرنس سے مخصوص تھیں قائم رہیں اور وہ اعلیٰ تخئیل جو کانفرنس کے ممتاز بانی نے پیش کیا قوم کی نگاہ میں جچا رہا۔"

پھر سیاسی ہیجان وطوفان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

" مگر ہمارے باہمت سکریٹری صاحب اِن نامساعد حالات سے خوفزدہ نہ ہوئے اور انھوں نے خاموشی مگر استقلال کے ساتھ اس کام کو جو اُن کے سپرد تھا جاری رکھا اور کئی جگہ بہت کامیاب اجلاس کانفرنس کے ہوتے رہے۔"

علّامہ اب تک غالباً اس صف میں نہ تھے جس کا تعلق اس کانفرنس سے تھا " جو نافۂ رمیدہ بو " نہ تھی بلکہ اس کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

علّامہ اور کشمیر

علّامہ نے اپنے کشمیری الاصل ہونے پر فخر کیا ہے۔ لیکن کشمیریوں کے مفاد میں ان کا صرف یہی عمل نظر آتا ہے کہ وہ انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور کے جنرل سکریٹری تھے۔ ۱۹۰۹ء میں ڈھاکہ کے خواجہ سلیم اللہ خاں نے وائسرائے کی کونسل میں فوج میں کشمیریوں کی ملازمت اور زراعت پیشہ ہونے کے متعلق سوال کیا تھا اور اسی بنا پر حکومت صوبہ نے اعداد وشمار فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا اب علامہ نے ایک اپیل شائع کی کہ قومی کارکنان ان اعداد وشمار کی فراہمی کے متعلق حکام سے تعاون کریں۔ نیز چند رباعیاں بھی مسلمانان کشمیر کی نسبت لکھیں۔ ذکر اقبال کے مرتب نے

دو رباعیاں بطور نمونہ پیش کی ہیں ؎

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

موتی عدن سے لعل یمن سے ہوا ہے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دُور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بُلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

مختلف زمانوں میں اکثر خاندانوں نے کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان اور خصوصاً پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اس سوال اور اپیل کا تعلق انہیں مہاجر کشمیریوں سے ہے لیکن ان لاکھوں مسلمانوں سے جو کشمیر میں تھے کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ مگر علی گڑھ پر اس کا سخت اثر تھا اور اُن کے مقاد میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جوائنٹ سکریٹری کانفرنس نے نہایت انہماک اور درد و جوش کے ساتھ جد و جہد شروع کر دی ۱۹۰۷ء میں اجلاس کانفرنس کراچی میں کشمیری طلباء کے لئے مخصوص وظائف حاصل کئے اور کالج و کانفرنس سے بھی اسی قسم کا انتظام کیا کہ غریب کشمیری طلبا جو علی گڑھ یا لاہور میں تعلیم حاصل کریں ان کی مدد کی جائے یہ جد و جہد مسلسل جاری رہی اور ہر سال کانفرنس میں ضرورت کے لحاظ سے قرار دادیں منظور ہوتی رہیں۔
ایک خاص سفیر کشمیر میں متعین کیا کہ وہاں کی تعلیمی ضروریات کے متعلق تحقیقات کر کے اعداد و صحیح حالات جمع کرے اور لوکل کمیٹیاں قائم کرائے

یوں تو کشمیر کے متعدد طلباء نے اپنے کردار و عمل اور قابلیت سے شہرت حاصل کی لیکن ان میں چودھری خوشی محمد خان ناظر اور سیاسیات میں اسیر پنجہ مظالم شیخ عبداللہ سابق وزیر اعظم کشمیر (جو اپنے وطن میں ہی بھارتی قیدی تھے) خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔

خود جا کر ایک وفد مرتب کیا اور مہاراجہ کے سامنے ایک میموریل پیش کیا۔ اگرچہ جواب دل شکن تھا مگر عزم صمیم سے وہاں کام کرتے رہے۔ واپس آکر تمام حالات ایک رسالہ کی صورت میں شائع کئے پھر مسلسل جدوجہد جاری رکھی اور علی گڑھ میں طلباء کی آمد و امداد کا سلسلہ قائم رہا لیکن علامہ کی کوئی تائید و امداد نظر نہیں آتی۔

باب ۳

اقبال کی شاعری

ڈاکٹر اقبال کا کلام خواہ اُردو ہو یا فارسی بلاشبہ ہر تعریف وستایش کا مستحق ہے اور مشرق و مغرب کے بڑے بڑے علما، و فضلا اور ناقدین نے اسے خراج تحسین بھی پیش کیا ہے اس میں اگر کسی جگہ زبان کی کوئی خامی بھی ہے تو وہ " النادر کالمعدوم " ہے وہ دہلی و صفاہان کے نہ تھے مگر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اقبال نے ان دونوں زبانوں کا دامن اپنی شاعری سے مالا مال کر دیا ہے ان کے بعض نظریات و تخیلات سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر جس حسن ادا سے وہ پیش ہوئے ہیں اس کی داد دینی پڑتی ہے اقبال نے فلسفہ و الہیات اور ادبیات عالیہ کو اس طرح نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ پڑھنے اور سمجھنے والے پر جوش و وجد بیک وقت مستولی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ ہے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے

بہرحال واہب العطایا نے بجز ایک ذات مقدس (بابی انت وامی) کسی کو اپنی موہبت کبریٰ کا خاتم نہیں بنایا لیکن بعض ہستیوں کو ایسی موہبت سے سرفراز کیا کہ ان کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اقبال بھی اُن ہی میں سے ایک ہستی ہے اور جس طرح کہ صدیاں گزرنے پر دوسرا رومی، حافظ، سعدی، غزالی و رازی پیدا نہیں ہوا اسی طرح دوسرے اقبال کا پیدا ہونا بھی مستبعد معلوم ہوتا ہے مگر اقبالیئن نے علامہ کی شاعری پر جو مبالغے کئے ہیں ان کی کوئی حد نہیں۔ اور بعض نے تو صریح توہین مذہب بھی کی ہے۔ ذیل میں بطور مثال چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "صمدیت کی اس بلند شان کا مظاہرہ اقبال نے اس وقت کیا۔"

(۲) "اقبال کی شان صمدیت میں چار چاند لگ گئے۔"

(۳) "اقبال کا متن پیغمبری اور حاشیہ شاعری ہے۔ ہم اسے داؤد و سلیمان کا شریک محض نہیں دیکھتے وہ موسیٰ عمران کی وادی میں ایک شعلۂ طور کا تعاقب کرتا نظر آتا ہے۔"

(۴) اقبال نے اس دنیا میں اس درجہ خود کو تنہا محسوس کیا تھا کہ کسی غمگسار رازدار اور ہمدم رفیق کار کی تلاش میں اُس نے

ے اسمائے حسنیٰ میں بعض ایسے صفاتی نام ہیں جو اس صفت کے رکھنے والے انسان کے لئے بھی بولے جاتے ہیں مگر بعض نام ایسے ہیں جو خدائے تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں جیسے صمد، غفار، حنان، منان، رحمٰن۔ زید بڑا رحیم یا غفور ہے۔ مگر زید بڑا غفار، یا منان یا رحمٰن نہیں کہہ سکتے۔

کائنات ارضی و کائنات سماوی کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ (اس چھان بین میں بحرِ متلاطم۔ فلک شگاف کہسار۔ بدرِ کامل سے ملاقات کے بیان کے بعد) "بحر و کوہسار اور ماہ و آفتاب سے مایوس ہو کر اب وہ خدائے واحد ذوالجلال کی طرف بڑھا اور عرض کیا کہ مولا کس کائنات میں تو نے مجھے پیدا کیا ہے کہ جس کا ایک ذرہ بھی میری رفاقت کا کام نہیں دے سکتا تیری مخلوق کائنات دل سے خالی ہے اور میری مشت خاک ہے کہ سراپا دل۔"

"خیابان و گلزار کی اچھی تخلیق ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن میرے درد کی دوا نہیں۔ خدائے یگانہ و بے مثال کے تبسم زیر لب اور پر تمکنت خاموشی نے اقبال کی تنہائی کی دستاویز پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔" (کہانی ص ۱۴۴)

(۵) "اقبال پیمبر حرکت و حرارت" کے عنوان سے مولوی صلاح الدین صاحب نے یوم اقبال ۱۹۵۵ء پر کہا کہ:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل خود ایک پارۂ نور ہے کہ ہر لحظہ اس نور الانوار سے کہ زبان قرآن میں "نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" ہے کسب ضیا کرتا اور پھر اس انداز سے منتشر کرتا ہے کہ تیرہ خاکدان کی دھند، خنکی، اور ظلمت ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہوئی ابد کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔"

(۶) اس نے شاعری بھی کی ساحری بھی کی اور پیغمبری بھی۔

در دیدہ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

(۷) "یہ کتاب دنیائے شعر کی معراج ہے جس تک ہر شاعر اعظم کی رسائی نہیں ہو سکتی اور جو شعر کے اس آخری پیغمبر کے لئے ہی مخصوص تھی (عنوانات کا ذکر نے کے بعد) سب کے بعد قرب حضور اور تجلیات سے پُر کنار ہوتے ہیں تبدا آتی ہے اور معراج ختم ہو جاتی ہے۔"

(۸) "ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ اقبال کو اسلام کے ساتھ کچھ ایسی والہانہ محبت تھی کہ یہ نغمے ان کے ساغر دل سے بے اختیار چھلک پڑتی تھی اس محبت کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اسلام تھے اور اسلام اقبال۔ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" گویا زبان پہلوی کے قرآن کا سورۂ اخلاص ہے۔"

(۹) ایک سیرت نگار ایک طولانی تمہید کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:-
"اقبال نے دیکھا کہ مشرق ایک بے روح تصویر بنا ہوا زندگی کے ہر گونہ ذوق اور تڑپ سے محروم ہے۔ صرف اٹلس کی زینت بن کر رہ گیا ہے اس قدیم سوز و گداز کو کھو بیٹھا ہے جس کے لئے اس نے چار دانگ عالم میں شہرت حاصل کی تھی سانس اس کے سینے میں کھیلتی دکھائی دیتی ہے لیکن روح سے خالی نرا ڈھانچہ ہے آرزو کا اس کے سینے میں گزر نہیں اس کی نے سے نغمے نکلنے سے پہلے ہی مر رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ مشرق کی وہ قوم جس نے تاریخ کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں میں بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کی تھی اپنی عظمت اور سطوت کی

بلندیوں سے قعرِ ذلت و انحطاط میں گرتی چلی جارہی ہے
اور ان آثار مذلت کا اس کو احساس تک نہیں۔
اغیار کی تدبیر کا کشتہ بنی ہوئی اپنی تخریب اور غیر کی تعمیر
اس کا کام رہ گیا ہے۔ منطق کی ناتمام دلیلوں اور حکمت و
فلسفہ کی دور از کار موشگافیوں میں گرفتار اپنے وجود سے
بے خبر قبر کی لاش کی طرح بے احساسی اور ذلت و خواری
کی زندگی گزارنے میں کوئی عار نہیں پاتی۔ پیران کہن حیا
سے بیگانہ۔ نوجوان عورتوں کی طرح مشغول تن کسی کے
دل میں بھی آرزوؤں کا گزر نہیں۔ اپنی ماؤں کے پیٹ
سے گویا مردہ پیدا ہو رہے ہیں راکھ کا ڈھیر ایک قوم تھی
شرارے سے خالی اس کا دن اس کی رات سے تاریک
کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرنے کی طالب اور بہر قیمت موت
سے بچنے کے لئے فکرمند، دولتمندوں پر بخل اور عیاشی کی
لعنت سوار ان کی نظر مغز سے بیگانہ اور صرف پوست
تک محدود ایک غاصب فرماں روا کی قوت و شوکت
اس کے لئے معبود بنی ہوئی اور اپنے دین و ایمان کے
نقصان میں اس کو اپنا فائدہ دکھائی دیتا صرف آج پر
قانع اور مستقبل کے ہر خیال سے اس کا دل خالی پند و موعظت
کے دفتر اس کی بغل میں دبے ہوئے لیکن گفتہ ہائے
بے عمل کا مجسم نمونہ۔ کعبہ کی اینٹوں سے دیر کی تعمیر
یعنی اغیار کے ساتھ پیمان وفا اس کا طرۂ امتیاز۔ حق سے

بیگانگی نے اس کو موت کی نیند سلا دیا تھا لیکن اس کو
اپنی موت تک کا احساس نہ تھا۔ شیوخ ملت اپنی دلنشین
تقریروں سے اغیار کی منشا و مراد کے مطابق تجدید اور احیائے
دین کی فکر میں لگے ہوئے مکتب و مدرسہ کا کام صرف اتنا کہ نوجوانوں
کا دماغ ان آقاؤں کی مصلحت اور استحکام کی تدابیر سوچتا رہے جن
کے ہاتھوں قومی وقار اور ناموس کا جنازہ نکل رہا تھا۔"
(کہانی ص ۲۶-۲۹)

سیرت و سوانح میں مبالغہ کے اس کمال کو یا ادبی شان کے شاندار مظاہرہ
کو دیکھنے کے بعد شاعری کے متعلق ایک دوسرا بیان جو خود علامہ کا ہے قابل
ملاحظہ ہے۔ مؤلف "ذکر اقبال" کہتے ہیں کہ :۔

علامہ کا الہام لفظی

ایک دفعہ کا ذکر ہے فارمن کرسچن کالج لاہور کا
سالانہ اجلاس تھا جس میں علامہ بھی مدعو تھے کالج
کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے علامہ سے کہا کہ آپ اجلاس اور چائے
سے فارغ ہونے کے بعد ذرا ٹھہریئے گا مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔
ڈاکٹر لوکس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد علامہ کے پاس آئے اور
سوال کیا کہ آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبی پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا
تھا جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ یا الفاظ بھی نازل ہوتے
تھے۔ علامہ نے صاف جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی
زبان میں آنحضرت صلعم پر نازل ہوتی تھی یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ
الفاظ بھی الہامی ہیں۔ ڈاکٹر لوکس نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا اور
کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسا عالی پایہ فلسفی الہام لفظی پر کیونکر اعتقاد

رکھ سکتا ہے۔ علامہ نے ارشاد فرمایا ڈاکٹر صاحب میں اس معاملہ میں کسی دلیل کا محتاج نہیں مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں محض شاعر ہوں جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے

اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں اور میں انھیں بعینہٖ نقل کرلیتا ہوں بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان اشعار میں کوئی ترمیم کرنی چاہی لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلہ میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں رکھا جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہوسکتا ہے تو اس میں کیا مقام تعجب ہے کہ آنحضرت صلعم پر قرآن کی پوری عبارت لفظ بہ لفظ نازل ہوتی اس پر ڈاکٹر تو کس لاجواب ہو گئے۔

کیفیت شعر سوال کیا گیا کہ آیا آپ پر شعر کہنے کی کیفیت اکثر طاری ہوتی ہے فرمایا نہیں!! ایسی کیفیت سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار ہوتی ہے لیکن اس وقت مضامین کے ہجوم کی حالت وہی ہوتی ہے جیسے کسی ماہی گیر کے جال میں اس کثرت سے مچھلیاں پھنس جائیں کہ وہ پریشان ہوجائے اور سوچ میں پڑ جائے کہ کس کو پکڑوں اور کس کو چھوڑوں۔ پھر فرمایا کہ عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل مدت کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کی پہلی کیفیت کے آخری لمحات میں جو اشعار کہے تھے ان کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ گویا یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔"

قبض اور بسط

پھر فرمایا کہ ایک دفعہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ خدا نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ میں نے شعر کہنے کی طرف توجہ مبذول کر دی لیکن ایک دن یک بیک وہی کیفیت عود کر آئی وہ اس قدر بھرپور تھی اور اتنی دیر تک رہی کہ چھ سات سال کے جمود کی تلافی ہو گئی۔

کسی قدر توقف کے بعد کہنے لگے کہ جب جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے جرمن زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھا تو اُس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ مجھ میں فکر و شعر کی جو تحریک پیدا ہوتی ہے اس کو جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جا سکتا ہے اور حالتِ حمل سے بھی جب تک میں اس تحریک کی تعمیل میں اشعار نہیں کہہ لیتا مجھے سکون محسوس نہیں ہوتا اور وہ سکون تکان اور ماندگی کیلئے ہوتا ہے۔

(ذکرِ اقبال)

اس الہام اور کیفیت کا سوانح نگار نے کوئی زمانہ متعین نہیں کیا اور اب یہ کسی ریسرچ اسکالر یا بزمِ اقبال کے ممبر کا کام تھا اور ہے کہ پورے کلام کا تجزیہ کیا جائے اور دکھایا جائے کہ کونسا الہامی ہے اور کونسا جنسی تحریک اور وضع حمل کی کیفیت کا۔

مبالغہ کے اس کمال کو دیکھنے کے بعد اب علامہ کے ادوارِ شاعری

پر نظر کیجئے۔

(۱) حسب بیان مرتب "فکر اقبال" ۱۹۰۵ء تک کی شاعری کو خود اقبال نے اپنی سخن گوئی کا دور اوّل قرار دیا ہے اس سنہ کو حد فاصل اس لئے بنایا کہ ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ چلے گئے۔ یورپ میں ان کے مطالعہ و مشاہدہ اور تفکر نے ان کی طبیعت کا رنگ بہت کچھ بدل دیا۔ اس سنہ تک اقبال کا کلام سو سے زاید کچھ صفحات پر بانگ درا میں ملتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں ابھی شاعری جزو پیغمبری نہیں بنی شاعر جس چیز سے متاثر ہوتا ہے اس پر شعر کہہ دیتا ہے۔ . . . اقبال جو کچھ بعد میں بنا اس کی داغ بیل ان نظموں میں بھی موجود ہے۔)

اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں جو محرکات و اثرات نظر آئے وہ گوناگوں ہیں مغربی انداز فکر نے اچھے نتائج پیدا کئے ہیں۔ کئی نظمیں انگریزی شعراء کے ترجمے ہیں۔

ہندو قوم کے پاس وطنیت کا کوئی ترانہ موجود نہیں تھا۔ اقبال نے جب اپنے شاعرانہ کمال کو وطنیت کی خدمت کے لئے وقف کیا تو مسلمانوں کے علاوہ بلکہ ان سے زیادہ ہندو اس سے متاثر ہوئے ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہند کے طول و عرض میں گونجنے لگا۔ (ص ۲۶)

(۲) ہندوستان میں وطنیت کے جذبہ کو جس شاعر نے پہلے گرمایا وہ اقبال با کمال تھا۔ ہندوستان اگر ایک قوم اور ایک وطن بن سکتا تو اقبال کا وطنیت کا کلام اس کے لئے الہامی صحیفہ ہوتا لیکن ملک کے حالات ایسے تھے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ یورپ سے واپس ہونے کے بعد اقبال اس

نتیجہ پر پہنچا کہ ہند ایک مخلوط الملل براعظم ہے اس کے مسائل کا حل مغربی انداز کی جمہوریت نہیں بلکہ دینی نظام سیاست ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل ہو اور ملک کے جس حصہ میں جس قوم کی اکثریت ہے اس کو وہاں کامل دینی اور معاشی آزادی حاصل ہو کوئی ملت دوسری ملت پر ناجائز غلبہ حاصل نہ کر سکے اور عادلانہ طور پر فیڈریشن کا انتظام ہو سکے۔ پاکستان کا مطالبہ اقبال نے سب سے پہلے اسی انداز میں پیش کیا[1] اس سیاسی ادھیڑ بن سے بہت پہلے ہی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق اقبال کے خیالات میں ایک تغیر عظیم واقع ہوا تھا۔ (ص ۴۴)

(۳) اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ جغرافیائی، نسلی، لسانی یا معاشیاتی وحدت ایک مصنوعی چیز ہے۔ اصلی وحدت فکری اور نظریاتی وحدت ہے اس لحاظ سے تمام دنیا کے مسلمان ایک وحدت ہیں۔

وطن کی محبت ایک لازمی و فطری چیز ہے چنانچہ وطنیت کے خلاف جہاد کرنے کے بعد بھی یہ جذبہ ان میں موجود تھا۔ (ص ۴۸)

(۴) ہندوستان کی روحانیت نے جو برگزیدہ انسان پیدا کئے ہیں اقبال نے ان پر نہایت خلوص فراخدلی اور وسیع المشربی سے نظمیں لکھی ہیں۔ ہندوستانی بچوں کے قومی گیت میں وہ پہلے ہی شعر کے دو مصرعوں میں چشتی اجمیری علیہ الرحمۃ و نانک دونوں کو پیامبران توحید و حق قرار دے کر کہتے ہیں ؂

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو باب اقبالی سیاست۔

باباگرونانک پر اقبال کی ایک مستقل نظم بھی ہے جو اس وقت کہی گئی ہے جب وہ زیادہ تر اسلامی نظمیں لکھ رہے تھے۔ اس نظم کے پہلے شعر میں گوتم بدھ کو بھی پیغمبر قرار دیا ہے ؎

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

باباگرونانک کی شان میں کہتے ہیں کہ ؎

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
اور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا[1]

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے[2]

(۵) بانگ درا میں نہایت خلوص کے ساتھ شری رام چندر جی کی توصیف میں کچھ اشعار لکھے ہیں ..... اقبال ان کو ہندوستان کا امام یا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں ؎ع

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند

پنجاب کے مشہور ہندو صوفی سوامی رام تیرتھ اقبال کے ہمعصر اور لاہور کالج میں پروفیسر تھے۔ انہوں نے تزکیۂ قلب سے عالم روحانی میں بلند مقام حاصل کر لیا تھا ..... ان کی وفات دریا میں غرق ہونے سے واقع ہوئی اقبال نے اس اہل دل پر بہت اچھے اشعار کہے جو بانگ درا میں درج ہیں ؎

---

[1] اقبال نے امیر بہاولپور کی مدح میں جو قصیدہ کہا اس کا ایک شعر ہے۔ [3] (باقی صفحہ ۱۰۵ پر دیکھئے)

صلح ہو ایسی کہ لیں مل جائیں ناقوس و اذاں
ساتھ مسجد کے رکھے بُت خانۂ آذر نہ کہیں

[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں توحید گرو نانک نے پھیلائی؟ تو کیا ادوار اوائل دسویں صدی سے قبل شرک ہی شرک تھا؟

(نوٹ) ان نظموں کے متعلق بھی اقبال اکیڈمی کے محققین کا فرض ہے کہ اس کی تحقیق کریں کہ آیا یہ الہامی ہیں؟ مسلم عقیدہ کی رو سے ہندو اور سکھ مشرک ہیں اقبال ان کی تعریف میں مذہبی انداز سے رطب اللسان ہیں۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو　　پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا

لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا　(بدرِ۵)

اقبال ۱۹۰۸ء سے پہلے حسن و عشق میں بہت سی نظمیں اور بہت سے اچھے اشعار لکھ چکا تھا لیکن وہ عشق مجازی تھا یا متصوفانہ انداز کا عشق.... اب اقبال جس عشق کی تلقین کرتا ہے وہ حیات لامتناہی کا عشق ہے. اقبال نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ باقی عمر میں شاعری سے اب احیائے ملت کا کام لیا جائے گا. فرماتے تھے کہ میرے والد نے مجھ سے یہ خواہش کی تھی اور مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنے کمال کو اسلام کی خدمت میں صرف کرنا۔ حالی کی شاعری کا رخ سرسید نے پھیرا اور اس کے جوہر کو ملت کے لئے وقف کر دیا۔ سید علیہ الرحمۃ کی صحبت سے پہلے حالی میں یہ چیز بالکل موجود نہ تھی۔ روایتی تغزل کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا[1]۔ اقبال میں یہ جذبہ شروع سے ہی موجود تھا لیکن اس میں شدت اور گرمی مغرب میں پیدا ہوئی۔ اس کی طبیعت میں یہ آفتاب حشر مغرب میں طلوع ہوا یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی غالباً سب سے پہلی نظم بلادِ اسلامیہ ہے۔ یہ نظم اس انقلاب کا پتہ دیتی ہے کہ اقبال نے اب وطنیت کے دائرہ سے باہر قدم رکھا ہے تھوڑے عرصہ بعد اسی ترانۂ ہندی کی زمین میں ترانہ ملی لکھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال کا فلسفۂ حیات بھی شدت کے ساتھ رجائی ہے۔ وہ دنیا والوں کے لئے امید

[1] حالی نے سرسید کی صحبت سے پہلے مثنوی حب الوطن اور مثنوی مناظرہ رحم و انصاف لکھی تھیں جو شائع بھی ہو چکی تھیں البتہ ۱۸۷۹ء میں مسدس میں سرسید کا اثر کارفرما ہے اور اس کا بیان خود دیباچہ مسدس میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۸۷۹ء کے بعد حالی نے اپنی نظموں کو ملت کے لئے ہی وقف کر دیا بلکہ حق تصنیف بھی محفوظ نہیں رکھا۔

کا پیغام رساں ہے جیسا کہ ہر اولوالعزم نبی بھی لا تقنطوا من الرحمتہ اللہ کی
ہی بشارت انسانوں تک پہنچانے کے لئے آتا ہے۔

اقبال اعلیٰ درجہ کا شاعر ہونے کے علاوہ مفکر اور مصلح بھی ہے۔ بعض
نظمیں وہ محض بہ حیثیت شاعر لکھتا ہے۔ بعض نظموں میں حکیمانہ افکار شعر کے پیرایہ
میں ڈھل گئے ہیں اور بعض نظموں میں جذبہ اصلاح غالب ہے۔ (صہ ۱۱۴)

سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک کی دہ سالہ مدت میں علامہ اقبال کی فکر کے دو
شعبوں نے نہایت واضح اور معین راہ عمل اختیار کی ایک خودی اور دوسرے
بین الاسلامی نظریہ......

اس دور کی اردو نظموں میں بلاد اسلامیہ۔ ترانہ ملی۔ وطنیت
ایک حاجی مدینہ کے راستے میں' شکوہ، جواب شکوہ، خطاب بہ جوانان اسلام'
حضور رسالتمآب میں۔ شفاخانہ حجاز، دعا، فاطمہ بنت عبداللہ، شبلی وحالی۔
صدیق ؓ۔ کفر و اسلام' بلال' اور متعدد نظمیں اسی بات کا پتہ دیتی ہیں کہ شاعر کے
دل و دماغ میں اپنے مقدس نصب العین کو مقبول بنانے کا جوش بدرجہ اتم پیدا
ہو چکا ہے...... ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کی آفت نازل ہوئی جو ۱۹۱۳ء تک رہی
جواب شکوہ تو مجروحین بلقان کیلئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لکھی گئی[1] (صہ ۱۱۷)

---

[1] جواب شکوہ کے متعلق بیان ہے کہ سنہ ۱۹۱۱ء کے ماہ اپریل میں انجمن حمایت الاسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں علامہ اقبال
نے اپنی مشہور نظم شکوہ دیوان خواص کے صحن میں پڑھی چند ماہ بعد موچی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں علامہ
نے جواب شکوہ تحت اللفظ پڑھ کر سنائی اب یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ مجروحین بلقان کے لئے لکھی گئی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں
نظم لکھی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں جنگ شروع ہوئی۔ جواب شکوہ کا ایک بند تھا۔

کشور ہند میں ہے کعبہ ناکام کا بت — عربستان میں شفاخانہ اسلام کا بت
اور لندن میں عبادت کدہ عام کا بت — لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

(بقیہ سلسلہ صہ ۱۰۵ الف ملاحظہ کیجئے)

مگر متذکرہ نظموں کے علاوہ اور نظمیں بھی ہیں مثلاً دار کانفرنس دہلی اور جلسہ فتح
لاہور۔ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے اظہارِ دالہی و عقیدت۔ آغا خاں اور قائدِ اعظم
پر طعن۔ پھولوں کا تحفہ۔ رات اور شاعر۔ موٹر۔ پھولوں کی شہزادی۔ کسی کی گود میں بلی
دیکھ کر انہیں کس شعبہ سے متعلق کہا جائے گا۔

مولانا سالک سوانح نگار کا بیان ہے کہ:۔

"مولانا میر حسن کی تعلیم کے اثر سے اقبال پر علوم اسلامی اور

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۰۵ کا) بادۂ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا بُت بھی نئے تم بھی نئے

جواب شکوہ ہی میں ایک بند اسی شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا

(جنگ بلقان کی طرف اشارہ ہے)

یہ اس زمانہ کی قومی تحریکات پر حملہ تھا۔ کلیہ ناکام یعنی مسلم یونیورسٹی کی تحریک پنجاب میں بارآور
ہو رہی تھی۔ چند ماہ پہلے فروری میں آغا خاں کے وفد فراہمی سرمایہ کا بڑا شاندار استقبال و جلسہ ہوا تھا۔ مسلم لیگ مسلم
دستوری تحفظات میں برابر کامیاب ہو رہی تھی اور دسمبر ۱۹۱۱ء میں کانگریس اور اس کے مابین ایک میثاق کی تجویز
ہو چکی تھی۔ بیمار حاجیوں کی سہولت کے لئے شفاخانہ اور لندن میں مسلمانان مقیم لندن اور نومسلموں کے لئے ایک مسجد کی تحریکیں
تھیں کیا یہی بین الاسلامی تنظیمات تھے کہ ان تحریکوں کو اصنام سے تشبیہ دی جائے اس نظم کی اشاعت کے بعد ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ خود ہی اس بند پر ناگواری عام کا خیال پیدا ہوا یا وہ ظاہر ہوئی تو اس کو تبدیل کر دیا۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں
بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے
قوم دنیا میں یہی احمدِ بے میم کی ہے

(باقی صفحہ ۱۰۷)

عرفان تصوف کے اسرار اور معارف بھی کھل گئے تھے"۔
لیکن ان کے اس بیان کے مطابق اقبال چالیس سال کی عمر تک اسلامی واصولی اقدار، پاکبازی و عفت سے حرماں نصیب تھے اور مرتب فکر اقبال لکھتے ہیں کہ:-

"اقبال کی شاعری وہ شاعری ہے جو شاعر کے تلمیذ الرحمٰن ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے اور جسے پیغمبری کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ ..... اردو فارسی کے تمام اساتذہ میں شاید کوئی دوسرا شاعر اس قماش کا مل سکے جس نے بغیر اپنی باطن کی نفسی تحریک کے کبھی شعر نہیں کہا۔"

اب ہم ذیل میں چند مختلف اشعار درج کرتے ہیں جن سے ان دعاوی پر پوری روشنی پڑتی ہے:-

غلامم جز رضائے تو نجویم — جز آں راہے کہ فرمودی نپویم
ولیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی — خرے را اسپ تازی گو نگویم

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

بہ یزداں روز محشر برہمن گفت — فروغ زندگی تاب شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم — صنم از آدمی پاینده تر بود

"اُمتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں" گستاخانہ کلمہ ہے، پیغمبر کی رسوائی کیا معنی وہ تو رسوا ہوتا ہی نہیں اسی طرح "قوم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ احمد بے میم احد ہوا۔ حالانکہ محمدًا عَبْدُہٗ وَرَسُولُہٗ صاف ہے۔ رسول اللہ صلعم کو احد نہیں کہہ سکتے مگر اس شعر کو بانگ درا سے خارج کرکے پھر وہی شعر کہا ہے — بادہ آشام الخ

فرنگ آئین رزاقی بداند | بایں بخشد از و واحی ستاند
بہ شیطان آنچناں روزی رساند | کہ یزداں اندراں حیراں بماند

چہ حاجت طول دادن داستاں را | بحرفے گویم اسرار جہاں را
جہان خویش با سوداگراں داد | چہ داند لامکاں قدر مکاں را

اگرچہ ما مرغان بے بال و پریم | از خدا در علم برگ افزوں تریم

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن | بگو با من کہ ایں پروردہ کیست

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے | قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح | تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو،

اصلاحی اور متروک نظمیں

ایک بزرگ مولوی بشیر الحق دسنوی نے ایک مستقل رسالہ میں ان اصلاحات کو جمع کر دیا ہے جو علامہ نے اشاعت اوّل کے بعد اپنے کلام میں کیں، مولوی عبدالسلام ندوی اس کی تمہید میں کہتے ہیں:۔

"ڈاکٹر اقبال کی شاعری پر ابتداء ہی سے یہ اعتراض ہوتا رہا کہ ان کے کلام میں بہت سی لفظی غلطیاں پائی جاتی ہیں اس

لئے وہ ہمیشہ اپنے کلام میں حک و اصلاح کرتے رہتے ہیں۔
اور ان کے مجموعہ مکاتیب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے

اپنے کلام کو نظرِ ثانی کے بعد چھپوایا ہے۔"

یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، لیکن سیرت نگاروں اور کلام اقبال پر ریسرچ کرنے والوں کا کام ہے الہامی ادعا کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ ان اصلاحی نظموں میں کوئی الہامی تو نہیں۔

انور حارث صاحب نے اقبال کی چند مخذوجہ بو متروک نظموں کو ایک رسالہ "رخت سفر" میں جمع کر دیا ہے اس کے پیش لفظ میں ڈاکٹر محمود حسین خاں (سابق وزیر تعلیم پاکستان) ان متروکات کو تاریخی اہمیت دیتے ہیں اور ایک امرتسری بزرگ محمد اسحٰق صاحب کہتے ہیں کہ:۔

"اقبال کے تخیل کے چند ایسے پہلو بھی نمایاں ہو جاتے ہیں جو مشرقی سیاست اور تمدن کے امور میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ثانیاً اس مجموعہ میں ایسے زاویہ ہائے نظر بھی موجود ہیں جنھیں بعد کے ادوار میں اقبال نے ناقص سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔"

ان کے مطالعہ میں بھی وہی بات دیکھنے کی ہے کہ الہامی شکل تھی یا دوسری کیفیتوں کی۔ مندرجہ بالا قسم کی نظموں میں معرکہ کی نظم حافظ کے متعلق ہے جو اسرار خودی میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں علامہ اقبال حافظ کی نسبت یہ لکھ گئے تھے۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار	جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او	مے علاج ہول رستا خیز او
مسلم و ایمان او زنار دار	رخنہ اندر دینش از مژگان یار

آں فقیرِ ملت مے خوارگاں   آں امام امت بیچارگاں

ایں فسوں خواں زندگی ازمار بود   جام اوشان جمی از مار بود

محفل او درخورِ ابرار نیست

ساغر او درخور احرار نیست

عامتہ" شعراء میں ہی نہیں بلکہ صوفیا ومشائخ اور علما وفضلا میں حافظ کی ایک خاص عظمت ہے اور اکثر تو حافظ کو لسان الغیب سمجھ کر دیوان حافظ سے فال نکالتے ہیں خود اقبال حافظ سے اتنے مسحور تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ انگلستان میں عطیہ بیگم سے کہا کہ :۔

"جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کرجاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔"

سنہ ۱۹۱۴ء میں مجلہ عثمانیہ کے لئے ایک دلچسپ نظم لکھی تھی اس میں کہتے ہیں کہ :۔

عجب مدار زسر مستیم کہ پیر مغاں   قبائے رندئ حافظ بقامت من دوخت

صبا بہ مولد حافظ سلام ما برساں

کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

اسرار خودی والی نظم کی اشاعت پر علامہ کے خلاف جو مضامین شائع ہوئے ان کے لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی دہلوی اور مطاعن کے اعظم الشعراء اکبر الہ آبادی بھی تھے۔ اقبال نے اکبر کو ایک خط میں لکھا کہ :۔

"میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے اسرار خودی میں جو کچھ کہا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر رہے اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا۔ اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔"

"اسرار خودی میں حافظ پر جو کچھ کہا گیا ہے اس کو خارج کرکے اور اشعار لکھے ہیں جن کا عنوان یہ ہے

"در حقیقت شعر و اصلاحِ ادبیات عالیہ"

ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی اور میرا اصلی مطلب واضح ہو جائیگا۔"

(۱۱ جون ۱۹۱۸ء)

اپنے وقت کے مشہور ادیب حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے بھی جو مرتب حیاتِ حافظ ہیں رسالہ الفاظ لکھنؤ میں ایک بڑا ریویو شائع کیا، جس کو دیکھ علامہ نے اسلم صاحب کو لکھا کہ :۔

"خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے ہیں ان کا مقصد ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن حُسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں یا مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں بہرحال میں نے وہ اشعار حذف کر دیئے اور ان کی جگہ اس لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں لیکن اس مقابلے سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک ضرور وجہ اشعار مذکور کو حذف کرنے کی تھی۔"

(۱۷ مئی ۱۹۱۹ء)

افسوس ہے کہ اقبال نے ایک نصب العین کے معاملہ میں بھی اس قدر بے ہمتی دکھائی کہ معترضین کے خوف سے اس کو بدل دیا مگر حیرت ہے کہ سیرت

نگار اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔

بقول مؤلف "ذکر اقبال":-

"جب اواخر جنگ میں وائسرائے نے دہلی میں وار کانفرنس منعقد کی تو بطور خاص نواب ذوالفقار علی خاں کی وساطت سے علامہ اقبال کو بھی طلب کیا اور اس موقع کے لئے ایک نظم کی فرمائش کی علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھا جس کے کل نو بند ہیں بطور نمونہ ذیل کے دو بند منقول ہیں!

اے تاجدار خطۂ جنت نشانِ ہند | روشن تجلیوں سے ترے خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند | تیغ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند

ہنگامۂ وغا میں میرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذرِ محقّر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقادِ خیر و شر | یہ روز جنگ تو ز جگر سوز سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایہ ظفر | آزادہ پر کشادہ پری زادہ یم سپر

سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرہ کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

اس کے بعد ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو لفٹیننٹ گورنر پنجاب نے جلسہ فتح منعقد کیا، علامہ بھی شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں جن کا کوئی تعلق جنگ سے نہیں تھا ارشاد فرمائیں۔ فارسی کے بھی چند اشعار سنائے۔

ہیچ میدانی کہ صورت بند ہستی با فرانس | فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد
روس را سرمایہ جمعیت ملت ربود | قہر او کوہ گراں را لرزہ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت در ابر انگلستان سپرد | جرمنی را چشم بے خواب و دل بیتاب داد

تا بما انگیزد لوائے حریت ارسلاو بر   صدر جمہوریہ امریکہ را مضراب داد
ہر کسے در خوردِ فطرت از جناب او بہ برد
بہر ما چیزے نبود خویش را با ما سپرد
(ذکر اقبال ص۸۷-۸۸ ء ۱۹)

افسوس ہے کہ مزید اشعار نہ مل سکے ورنہ اور بھی اسرار طبع کھلتے۔ یہ نظم رخت سفر تبرکات اقبال وغیرہ میں بھی نہیں ہے۔ نہ معلوم کس حالت کی ہے۔

مدحت طرازی

شعر و سخن میں حمد و نعت اور مناجات و منقبت کی طرح بادشاہوں اور امیروں کی مدح بھی ایک روایتی چیز ہے شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے مدحت سرائی نہ کی ہو اول الذکر چاروں اصناف کا تعلق روحانیت سے ہے اور آخر الذکر دنیوی فائدوں اور امیدوں سے متعلق ہے بے غرضانہ مدحت کی شاید ہی کوئی مثال ہو۔

اقبال کے ہاں بھی مدح طرازی ابتدائی مشق سخن سے لیکر آخر کمال تک ان کے کلام میں موجود ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایسی نظموں کو ان کے مجموعہ نظم سے خارج رکھا گیا محض اس لئے کہ اس میں تنقیص کا ایک پہلو ہے۔ بہر حال وہ اس باب میں دوسرے شاعروں سے کوئی امتیاز نہ رکھتے تھے۔

۱۹۰۳ء میں نواب بہاولپور عباسی پنجم کی صدر نشینی کے موقع پر ۴۸ شعر کا قصیدہ لکھا جو نومبر ۱۹۰۳ء کے رسالہ مخزن میں دسرا شیخ عبدالقادر مدیر رسالہ نے ایک تمہید کے ساتھ شائع کیا مگر کلیات میں اسے جگہ نہ ملی۔

۱۹۱۰ء میں مہاراجہ سر کشن پرشاد کی مدحت میں ۳۹ اشعار ہیں۔ ابتداء میں ایک بہاریہ تشبیب ہے پھر گریز کر کے دکن اور نظام کی تعریف اور ازاں بعد مہاراجہ کی مدح ہے لیکن بانگ درا میں "نمود صبح" کے عنوان سے صرف ابتدا کے نو شعر ہیں حالانکہ اس قصیدے

سے قبل شکریہ کے عنوان سے جو نوٹ تحریر کیا تھا اس میں لکھا کہ:-

"ہزاکسلنسی کی نوازش کریمانہ و وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑے ہیں وہ میرے دل سے کبھی نہیں مٹیں گے"۔

پھر باہم تعلقات میں ایسی وسعت اور ایسا خلوص رہا کہ اقبال کے دوستوں میں اس کی مثال نہیں لیکن ان نقوش کو جو مارچ ۱۹۱۰ء میں قائم ہوئے خود ہی بانگ درا کی ترتیب کے وقت مٹا دیا۔

۱۹۱۴ء میں "اسرارِ خودی" کو ایک تمہیدی نظم کے ساتھ سر سید علی امام کے نام معنون کیا جو اس زمانہ میں گورنر جنرل کی اگزکٹو کونسل میں لا ممبر تھے اور حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ پر مقرر ہونے والے تھے اس گرانمایہ کتاب اور موصوف میں کوئی مناسبت ہی نہ تھی البتہ اقبال کو حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کی امید ہو گئی تھی۔ اس نظم کے تمہیدی اشعار یہ ہیں ؎

اے امام سید والا نسب سلطنت را دیدۂ فرزانہ آمدی
دودمانت فخر اشراف عرب عقل کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنی بیگانۂ
جلوۂ شمع مرا پروانۂ

ان اشعار کے بعد ۵ اشعروں میں اپنی رفعت تخیل کو بیان کر کے آخری شعر کہتے ہیں ؎

نذر اشک بیقرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

مگر اسرارِ خودی کی اشاعت ثانی میں یہ اشعار خارج ہیں مؤلف "ذکر اقبال" سر علی امام سے تلون کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کسی موقع پر ان کے جذبہ اسلامیت نے علامہ اقبال کو متاثر کیا ہو اور علامہ نے اس تاثر کے تحت

اسرار خودی ان کے نام معنون کر دی ہوئے (صفحہ ۱۵۹)

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ لوگوں نے تعنون پر اعتراض کیا کہ ایسی کتاب کو ایک خطاب یافتہ دنیا دار اور ایک ریاست کے وزیر اعظم کے نام پر معنون کرنا کیا معنی؟ مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ سر علی امام اس وقت صدر اعظم نہ تھے بلکہ ۱۹۱۶ء میں ہوئے اس وقت تو لا ممبر تھے البتہ اقبال جیسا کہ شاد کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"سرکار ظہور امام کی خبر دیتے ہیں پھر کیا عجب کہ اقبال کی دیرینہ ارادت اور ہماری شاد کی کشش متحد ہو کر کام کر جائیں۔"

(۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء)

اقبال ایک مدت سے منتظر امام تھے اور اپنی امیدوں کی پرورش کر رہے تھے علامہ نے "رموز بے خودی" نظام سابع کی خدمت میں حسب ذیل مدحیہ اشعار کے ساتھ پیش کی:۔

اے مقامت برتر از چرخ بریں	از تو باقی سطوت دین مبین
جلوۂ صدیق از سیمائے تو	حافظ ما تیغ جوشن خائے تو
از تو مارا صبح خنداں شام ہند	آستانت مرکز اسلام ہند
دوش ملت زندہ از امروز تو	تاب ایں برق کہن از سوز تو
بندگانستیم ما تو خواجہ	از پئے فردائے ما دیباچہ
گوہرم را شوخی اش بیباک کرد	تا گریبان صدف را چاک کرد

پیش سلطاں ایں گہر آوردہ ام

قطرۂ خون جگر آوردہ ام

مدح کے جو نمونے ہم نے پیش کئے ہیں ان کو دیکھ کر قدرتی طور پر اس بات کے دیکھنے کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان عالی مرتبت امراء

درؤساء نے اس مدحت کی قدر یا شکر گزاری کس ہنج سے کی یعنی علی امام نے اسرار خودی کے تعنون اور شاعر کے اشک بیقرار اور گریۂ بے اختیار" کو کس طرح قبول کیا۔ نظام نے اس "قطرۂ خون جگر" کو جو رموز بے خودی میں موتی بن کر ٹپکا ہے جواہر خانہ دل میں کیسے رکھا کشن پرشاد سے جو امیدیں تھیں وہ کیا گل و ثمر لائیں۔

سیرت نگار سب خاموش ہیں اور علامہ نے بھی کہیں اشارۃً ذکر نہیں کیا۔ البتہ تاجدار ہند نے سر کی نذر محقر قبول کر کے سر بنا دیا۔

بعض مدحیہ نظموں میں علامہ نے تشبیہات و استعارات کا نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو مذہبی احساس پر بار ہو جاتا ہے۔ نظام کی مدح میں ان کے آستانہ کو "مرکز اسلام ہند" کہنا یقیناً عظمت اسلام کے منافی ہے پھر اس اضافت کا مطلب فی بطن شاعر رہا۔ اسلام تو عرب، ترک، ایران، غرض تمام دنیا کا ایک ہی ہے۔ چین و عرب اور ہند کی تقسیم کے کیا معنی ہیں؟

تشریحات کلام

اقبال کے کلام کا بڑا حصہ پوری تشریح کا محتاج ہے اور جب تک شرح سامنے نہ ہو شاعر کی فکر پر عبور نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مطلب اخذ ہو سکتا ہے اور بقول مؤلف "سیاسی کارنامہ" اقبال کو سمجھنا اگر مشکل ہے تو سمجھانا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ ایک سیرت نگار لکھتے ہیں کہ:۔

"اقبال کے متعلم کو اگر صحیح معنی میں اقبال کی روح سے اتصال پیدا کرنا ہو اور اس کے پیام کی گہرائیوں تک پہنچنا مقصود ہو تو اس کو ان تینوں مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔ اس میں اتنا ادبی مذاق ہونا چاہیئے کہ اقبال کے بلند پایہ ادبی خصوصیات لطیف تلمیحات و اشارات اور

دور رس استعارات وکنایات کی تہہ تک پہنچ سکے۔ ادب کا جو نقطۂ معراج ہوتا ہے وہی فلسفہ کے لئے نقطۂ آغاز کا کام دیتا ہے جو نگاہ فلسفہ کی غلام گردش میں بھٹک کر رہ جائے اور فکر انسانی کے تدریجی ارتقا سے کماحقہ واقفیت کا موقع نہ پاسکی ہو وہ اقبال کے عمیق فلسفیانہ مباحث کے سمجھنے سے قاصر رہے گی۔ فلسفہ جب اپنی معراج پر پہنچ چکتا ہے تو جب کہیں مابعد الطبیعاتی اور الٰہیات کے مباحث کے آغاز کی نوبت آتی ہے۔ چیست عالم چیست آدم چیست حق ......

جن تین بلند سطحوں پر مضبوطی سے قدم جما کر اقبال نے فکر کے ان گنجلک عقدوں کو حل کیا ہے اقبال کے شارحین ہیں خود ان کو بلند سطحوں تک پہنچانے کے بجائے اقبال کو اپنی پست سطحوں پر لے آنے کا میلان زیادہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔" (کہانی ص ۲۷)

مرتب "اقبال نامہ" و "مکاتیب اقبال" کہتے ہیں:۔

"میری تجویز و درخواست پر مولوی محمد مبین صاحب عباسی کیفی چریاکوٹی نے جن کے علم و فضل کا احترام خود اقبال کو تھا "تلمیحات اقبال" کے نام سے ایک کتاب مرتب کرنی شروع کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے قرآن کریم، احادیث نبیؐ اور تاریخ ادب اسلام سے متعلق کلام اقبال میں جو حوالہ جات اور اشارات پائے جاتے ہیں ان کی تشریح و توضیح سے اقبالیات کی ہر دلعزیزی و عالمگیری میں معقول اضافہ ہوگا۔"

قاضی اختر اپنی کتاب "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" میں کہتے ہیں کہ:۔

"اقبال کی شاعری تمام قرآنی تعلیمات پر مبنی اور اس کا پس منظر قرآن ہی قرآن ہے اور اسی لحاظ سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا یہ جامع و مانع قول اس صداقت کو واضح کرتا ہے کہ "اقبال قرآن کا شاعر ہے اور شاعر کا قرآن ہے۔"

(اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

اور اسی سلسلہ میں پھر وہ اقبالی انجمنوں کے لئے حسب ذیل لائحہ عمل بھی پیش کرتے ہیں۔

(۱) ایک جامع لغات کی ترتیب جس میں اقبال کی تمام تصانیف میں مختلف علمی و فنی اصطلاحات کو بہ ترتیب حروف تہجی۔ جمع کر کے اُن کے معنی و مطالب کی تشریح کی جائے۔

(۲) اقبالی تلمیحات و اشارات پر ایک جامع کتاب کی تدوین جس میں تمام تلمیحات کی تشریح و توضیح ہو۔

(۳) فہرست اعلام و اماکن جس میں کلام اقبال کے تمام اشخاص و اماکن اور کتب کا احوال ہو۔

(۴) سیرت اقبال بڑے پیمانہ پر تیار کی جائے جو اُن کی زندگی کے تمام حالات و خیالات کے مختلف شعبوں اور کارناموں پر حاوی ہو۔

(۵) کلام اقبال کے مجموعوں کے خاص ایڈیشن مقدمات اور تشریحی حواشی کے ساتھ شائع کئے جا سکتے ہیں۔

تضاد اقبال کی زندگی کی تمام روداد پڑھنے کے بعد ضمیر یا فکر و عمل کا یہ عجیب تضاد نظر آتا ہے کہ وہ ایک طرف "کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو" کا نعرہ لگاتے ہیں اور نوجوانان ملت میں ایک لہر پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف امرا کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں۔ اُن کے آستا

پر حاضری کو شرف جانتے ہیں ایک غیر مسلم امیر کے نام "کشن پرشاد" میں ذوالمنن کی ہم عددی جتا کر اپنی تقدیر کر مخفی دیکھتے ہیں اور اس کی نظر عنایت کی تمنا کرتے ہیں اس کی ایسی خدمت انجام دینے کے لئے جس سے اپنی توقعات بھی وابستہ ہیں مجذوبوں، سجادہ نشینوں اور مزاروں پر حاضری کے لئے اوقات عزیز صرف کرتے ہیں اور استخارہ کو بھی رہنما جانتے ہیں۔ وہ پیغام میں تو "نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" سناتے ہیں مگر اپنی تقدیر دوسروں کے ہاتھوں میں سپرد کر دیتے ہیں۔

دراصل تقدیر سے انھوں نے ایک قسم کی بغاوت کی اور تقدیر نے ان کو سزا دی انھوں نے دوسروں پر بھروسہ کیا جو کبھی کامیاب نہ ہوا۔

اقبال کے وہ خطوط جو سرکشن پرشاد اور سر راس مسعود کے نام ہیں اور نعنوں کے اشعار جو امیر امان اللہ خاں وغیرہ کے نام ہیں پڑھنے کے بعد دیکھئے ؎

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

در جہاں جز درد دل درماں مخواہ
نعمت از حق خواہ واز سلطاں مخواہ

از غم ہستی مئے گلفام گیر
نقد خود از کیسہ ایام گیر

فطرتے کو بر فلک بندد نظر
پست می گردد ز احسان دگر

منت خاک خویش را از ہم مپاش
مثل مہ رزقِ خود از پہلو تراش

کار مرداں سرت تسلیم و رضا
بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا

اگر اقبال کی سیرت اور حالات کو ان کے خطوط ہی کی روشنی میں دیکھا جائے تو عامۃً ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں قناعت نہ تھی شاعرانہ تخیلات اور خانگی تفکرات نے سخت کوشی محنت اور عزم و استغنا سب ہی کو مجروح و معطل کر دیا تھا۔

بوجہ: نعسری سے طبعاً متنفر تھے، قانونی پریکٹس میں محنت نہ کر سکے

تھے ۔ یہی سبب تھا کہ وہ کبھی حیدر آباد کی سمت دیکھتے تھے کبھی افغانستان کی طرف نظر دوڑاتے کبھی منتظر امام رہتے ۔ کبھی سرکشن پرشاد کی وزارت کے لئے دین المجائز کے مطابق وہ جتن کرتے جو ایک متقی اور حکیم امت سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتے۔

اقبال کی روداد زندگی ان کے تمام پیغامات سے زیادہ سبق آموز اور بصیرت افروز ہے ۔ واہب العطایا نے علم و عرفان ذہنی قابلیت دماغی قوت اور نفسانی بصیرت سے انہیں بڑا حصہ عطا کیا تھا مگر اقبال نے اس کی قدر نہ کی اور ان عطیۂ الٰہی سے فائدہ نہ اٹھایا۔

اقبال کے تمام اصناف کلام پر نظر ڈالنے کے بعد جہاں اُن کے کمال شاعری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے وہاں یہ بھی تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ قرآنی تعریف "فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ"[1] ان پر صادق آجاتی ہے۔

اُن کے پیغامات بڑے دلچسپ ہیں لیکن علامہ کی پوری روداد زندگی ہمارے سامنے ہے اس میں اپنے ہی پیغامات کا کوئی پرتو نہیں اور وہ "أَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ"[2] کے مصداق ہو گئے ہیں۔ قرآن کی اس تنبیہ کا کہ "كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ"[3]، کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔

---

[1] وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں (سورۂ شعراء ۲۲۵)

[2] اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں (سورۂ شعراء ۲۲۶)

[3] خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں (سورۂ الصف ۳)

باب ۴

اقبال اور سیاسیات

(اقبال کی فکرِ سیاسی کے متعلق بیانات اور ان پر تبصرہ)

اقبال کی سیاسی فکر کا آغاز تو "ترانہ ہندی" اور "ہندوستانی بچوں کا گیت" دو نظموں سے ہوا اور پھر متحدہ قومیت یا ملک کی قومیتِ واحدہ "نئے شوالہ" میں جلوہ گر ہوئی

خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے یا

آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھپا دوں یا

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مگر لندن میں بزمانۂ تعلیم تین سال مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کے ممبر رہے وہاں سے مراجعت کے بعد اس فکر میں یہ تضاد ہو گیا کہ ع

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے یا

قومیّت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے،

لیکن وہ عملاً کسی سیاسی جماعت سے متعلق نہیں ہوئے بلکہ مسلم لیگ سے بھی اتنے بیزار تھے کہ بیساختہ کہہ اُٹھے:۔

لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بُت

مگران افکار سے ان کے سیاسی عقائد اور اُن کے تضاد پر جو بحث کی گئی ہے وہ بے معنی ہے یہ صرف شاعرانہ زورِ طبع ہے ان کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ:۔

"سنہ ۱۹۱۳ء کے وسط میں جنگ بلقان ختم ہوئی اور سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ کا آغاز ہوا، اقبال طبعاً بھی اور مصلحتاً بھی عملی سیاست سے علیحدہ رہے بلکہ غیر سیاسی مجالس میں بھی نظر نہ آتے تھے۔" (ذکر اقبال ص ۱۰۱)

ایک اور مقالہ نگار ضیائی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ:۔

"اقبال شروع سے لے کر آخر تک کبھی بھی عوام کی کسی جد وجہد میں شامل نہ ہوئے نہ عملاً اور نہ فکراً۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ طبعاً عزلت نشین تھے اور باہر کی دنیا کی خبریں یا تو کتابوں[1] میں پڑھ لیتے تھے یا اپنے ہاں آنے والوں سے سنا کرتے تھے اور انہیں پر اپنے سیاسی افکار کی تعمیر کرتے تھے اور ان کو بحیثیت ایک شاعر اور مفکر کے ان کا تخیل اور تفکر زمانہ پر زیادہ انحصار تھا اس لئے ان کے سیاسی افکار میں واقعیت کے بجائے تخیل آرائی زیادہ ہوتی تھی۔"

سنہ ۱۹۲۶ء سے انھوں نے عملی سیاست میں صوبہ کونسل کی ممبری سے حصہ لینا شروع کیا، پھر وہ اسی حیثیت سے آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی میں شریک ہوئے اور وہاں تقریر بھی کی۔ ازاں بعد جب مسلم لیگ میں اختلاف ہوا اور سر محمد شفیع نے علیحدہ لیگ قائم کی تو اس کے معتمد ہوئے اور اسی معتمدی سے سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد

---

[1] صحیح لفظ "اخباروں" ہونا چاہیئے۔

کے اجلاس کی صدارت کی، ازاں بعد دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے ممبر نامزد ہو کر انگلستان گئے واپس آئے تو مسلم کانفرنس کے صدر رہے مگر بہت جلد یہ ادارہ تحلیل ہو گیا۔ اس لئے اس کے عہدہ داروں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ نے پارلیمنٹری بورڈ بنائے تو پنجاب میں اس کے صدر منتخب ہوئے مگر عملاً اس کے متعلق خاموشی ہے۔ بلکہ علامہ کے خط سے بیزاری پائی جاتی ہے۔

یہ اقبالی سیاست کا ایک اجمالی خاکہ ہے اب ذرا کچھ تفصیل دیکھیے:۔

مولوی محمد احمد خاں ایم اے ایل ایل بی نے پانچ سو صفحات سے زیادہ کی ایک مستقل اور مبسوط کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" کے نام سے تالیف کر کے شائع کی ہے جس میں علامہ کے سیاسی زندگی کو متعلقہ پس منظر کے ساتھ شرح و بسط سے لکھا ہے۔ ایک موقع پر وہ رقمطراز ہیں کہ

"(۱) اوّلین مرحلہ پہ علامہ وطن پرست تھے اور پھر ملت کی طرف راجع ہوئے"

ازاں بعد کچھ عرصہ تک ان کے عزلت نشین رہنے اور جنگ عظیم کا خاکہ پیش کر کے کہتے ہیں کہ:۔

اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے سیاسی معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لی ایسے وقت میں جب کہ امن عالم کے خرمن میں آگ لگ چکی تھی اور اندرون ملک سیاسی اتحاد اور سیاسی آزادی کی جدوجہد جاری تھی ڈاکٹر صاحب دنیا کے ان سارے ہنگاموں سے دور پوری شاعرانہ آن بان اور فلسفیانہ شان کے ساتھ لاہور کے ایک گوشہ میں بیٹھے اسرار خودی اور رموز بیخودی لکھ رہے تھے۔ اسرار خودی ۱۹۱۳ء میں لکھنی شروع کی اور ۱۹۱۵ء میں اس کو ختم کیا۔ رموز بے خودی کے لکھنے کا آغاز ۱۹۱۵ء سے ہے اور اس کا اختتام ۱۹۱۶ء میں ہوتا ہے"

پھر مصنف نے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۲ء تک جو حالات پیش آئے اور سیاسی رفتار رہی اس کو لکھ کر علامہ کے رجحانات دکھاتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:۔

"علامہ اقبال جنگ عظیم کے بعد سے ۱۹۲۳ء تک اپنی شہرہ آفاق کتاب "پیام مشرق"[1] کی تکمیل میں لگے رہے، لیکن اس زمانہ میں وہ لاہور میں بیٹھے کبھی کسی جاں نثار قوم پر تحسین و آفریں کے پھول برساتے اور کبھی اس کی چٹکی بھی لے لیتے تھے چنانچہ مولانا محمد علی کی بیتول جیل میں نظر بندی پر انہوں نے یہ اشعار لکھے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند[2]

مولانا محمد علی کی سرکردگی میں جب وفد خلافت یورپ گیا تو انھوں نے دریوزہ خلافت کے عنوان سے حسب ذیل قطعہ لکھا:۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے تو جائے | تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا | خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے | مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

---

[1] پیام مشرق ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔

[2] یہ اشعار امرتسر میں دسمبر ۱۹۱۹ء میں پڑھے گئے۔

اب غور کیجئے کہ جو زمانہ دسمبر ۱۹۱۱ء سے شروع ہوا وہ عالم اسلام کے لئے بڑے آلام و مصائب کا تھا، جس کی ابتدا میں طرابلس اور بلقان کے دلدوز واقعات پیش آئے۔ علی گڑھ کے نوجوان اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے ایثار اور انابت الی اللہ کی مثالیں قائم کیں طرابلس فنڈ جاری کیا آپس میں چندے کئے لذیذ اغذیہ ترک کیں اور اس کی بچت اسی فنڈ میں داخل ہوتی، روزے رکھے، مسجد میں مجتمع ہو کر دعائیں کیں تمام ارکان اسٹاف اور آنریری سیکرٹری اس جوش اور ایثار میں شریک تھے۔

پھر ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کے فنڈ میں نہ صرف چندہ دیا بلکہ سینئر کلاسوں کے پانچ طلباء التوائے تعلیم کر کے اس میں شریک ہو کر ترک مجروحین کی خدمت کے لئے روانہ ہو گئے۔ اسی کالج کے مایۂ ناز فرزند مولانا ظفر علی خان نے ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک سینوں میں جوش و جذبات کا طوفان برپا کر دیا۔ ان کا اخبار زمیندار ایک صور تھا جس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ مگر اس دور مصائب میں علامہ اقبال کا صرف یہی تاثر اور عمل ہے کہ انھوں نے فاطمہ بنت عبداللہؓ اور شہیدان طرابلس پر دو مختصر نظمیں لکھیں اور اپنی تمام قوت، توانائی اور جوش و قابلیت کو اسرار خودی کی تکمیل کے لئے وقف رکھا حتیٰ کہ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مولانا شوکت علی نے ان کو مدعو کیا تو اس دعوت کا یہ جواب دیا کہ:-

"بھائی شوکت اقبال گوشہ نشین ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چہار دیواری کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے، دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے، تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصے سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہئے مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری

سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے، یہ چند اشعار میری طرف سے ان کی خدمت میں عرض کر دیجئے :-

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا تھا آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا

تمدن آفریں خلاق آئین جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں کہہ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

علامہ زوال خلافت اور ترکوں پر جو افتاد پڑی اس سے بھی کچھ بہت متاثر نہیں معلوم ہوتے اور انھیں بقائے خلافت کی مساعی بھی ناپسند معلوم ہوتی ہیں اس سلسلے میں مولوی سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ :-

"دوسرے صفحہ پر چند اشعار معارف کے لئے لکھتا ہوں مدت سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی، گذشتہ رات زکام کی وجہ سے سو نہ سکا یہ تاثر ایک چھوٹی سی نظم میں تضمین کی صورت میں منتقل ہو گیا۔ واقعات صاف اور نمایاں ہیں۔ مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے

اور لندن[1] کے شیعوں کے اشاروں پر ناچتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس مفصل عرض نہیں کر سکتا کہ زمانہ نازک ہے اس خط کو پرائیویٹ تصور فرمائیے:"
یہ نظم وہی ہے جس کا عنوان دریوزۂ خلافت ہے اور جس کو سیاسی کارنامہ کے مصنف نے چشکی سے تعبیر کیا ہے۔

مگر واقعات یہ ہیں کہ اسی سال جب علی برادران قید فرنگ سے رہا ہو کر امرتسر کے اجلاس مسلم لیگ میں آئے تو علامہ نے جو شریک اجلاس تھے ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ وہ قطعہ سنایا جو مصنف نے تحسین کے پھول برسانے کے مترادف قرار دیا ہے انہوں نے اسٹیج پر آکر کہا:۔

"جناب صدر و حضرات!! علی برادران[2] کے اس جلسہ میں تشریف لانے پر جو قبلہ صدر نے ارشاد فرمایا ہے اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں، یہ دونوں بھائی قوم کے عزیز محبوب ہیں نہ صرف ان خدمات کے عوض جو انھوں نے قلمی زبانی یا کسی اور طریق سے انجام دی ہیں بلکہ میرے خیال ناقص میں ایک بہت بڑی خدمت کی ہے جس نے انہیں پہلے سے زیادہ مخدوم بنا دیا ہے اس کا ذکر اس وقت ضروری ہے وہ خدمت اُن کی دینی استقامت ہے علی برادران کی نظر بندی کا زمانہ اور ان کی دینی استقامت بمنزلہ ایک چٹان کے ہے جس پر مسلمانوں کی سیرت کا آئندہ محل تیار ہوگا۔"

"صاحبان یہ یاد رکھئے" اگر اس ملک و قوم میں علی برادران ایسے قابل اور پکے فرزندانِ اسلام ایک درجن بھی پیدا ہو جائیں تو قوم کی سوشل پولیٹیکل اور دیگر حالتوں کی اصلاح کے لئے کافی ہوں گے۔ کل مجھے معلوم ہوا کہ ان کا تار آیا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ کل صبح امرتسر پہونچیں گے اس موقع پر دو تین اشعار میرے خیال میں آئے اور یہ قدرتی بات ہے

---

[1] سر آغا خاں اور سید امیر علی کی جانب اشارہ ہے جو ان دنوں لندن میں مقیم تھے۔
[2] مصنف ذکر اقبال کا بیان ہے کہ امرتسر جاتے ہوئے وہ دہلی رکے تھے۔

کہ جو محبت اور اخلاص ان سے مجھے ہے ان کا کسی قدر اظہار ان اشعار میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ کے مندرجہ ذیل شعر پر دو تین شعر موزوں کئے ہیں اور عرض کرتا ہوں:

شہپر زاغ و زغن الخ

(رپورٹ مسلم لیگ ۱۹۱۹ء)

مسلم لیگ کا یہ اجلاس بہت شاندار تھا ہزاروں کوس کا سفر کر کے بہت سے ممبر شریک ہوئے تھے، صدر استقبالیہ مولوی ثناء اللہ اور صدر اجلاس حکیم اجمل خاں تھے۔ مسٹر محمد علی جناح بھی شریک اجلاس تھے۔ انھیں دنوں کانگریس کا اجلاس بھی منعقد ہو رہا تھا لیگ کی قراردادوں میں مظالم پنجاب، خلافت اور ہندوؤں کے ساتھ مواخاۃ اہم مسائل تھے جن پر علامہ کے خیالات بھی یقیناً اہم ہوتے مگر انھوں نے کسی قرارداد کے متعلق کوئی تائیدی ترمیمی یا اختلافی حصہ نہیں لیا۔

اب وفد خلافت و علامہ کے واقعہ کا دوسرا رخ بھی دیکھئے، جب یورپ سے وفد واپس آیا تو مولوی سید سلیمان ندوی کو جو خلافت کی مذہبی حیثیت واضح کرنے کے لئے شریک وفد تھے علامہ لکھتے ہیں کہ:

"مراجعت مع الخیر کی مبارک آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربار نبویؐ سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا، وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے، اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ ۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔"

(۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

اس خط کے ساتھ پیچھے مڑ کر تیرہ ماہ قبل کا خط ۱۷ ستمبر ۱۹۱۹ء والا پھر پڑھ لیجئے

مرتب مکاتیب لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت علامہ نے جنگ ہائے طرابلس و بلقان میں ایک دلدوز نوا بلند کی اور جنگ اوّل کے بعد تحریک خلافت میں ایک حد تک خود شامل رہے۔

مگر یہ نوائے دلدوز صرف دو نظموں ہی میں محدود نظر آتی ہے، البتہ تحریک خلافت کی شمولیت ایک عملی اقدام تھا اس کی وضاحت نہیں کی لیکن علامہ کے اُن خطوط میں جو مکاتیب اقبال ہی میں شائع ہوئے ہیں یہ وضاحت موجود ہے جس سے حد کا تعین ہو سکتا ہے۔ وہ خطوط یہ ہیں۔

(۱) "مسئلہ خلافت ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے۔ اس خیال سے کہ اس مسئلہ کے متعلق مسلمانوں کو امر بالمعروف کرنا میرا فرض ہے جلسہ میں چلا گیا۔"

(۹ نومبر ۱۹۱۹ء)

"(۲) جو تقریر میں نے کی وہ ایک رزولیوشن کی تائید یا شاید تحریک میں تھی مسئلہ خلافت پر نہ تھی، مذہبی پہلو اس کا حرمین کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔"

(۱۵ دسمبر ۱۹۱۹ء)

ان واقعات کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ایسے امور میں شمولیت کے لئے جرأت و ہمت چاہیئے علامہ تو ۱۹۱۴ء کے زمانہ کو بھی "طوفان بے تمیزی" اور "گھر کو کشتیٔ نوح" سمجھتے تھے۔ یہ زمانہ تو مقابلتہً زیادہ نازک تھا۔

اسی زمانہ میں اکبر الہ آبادی نے کچھ اشعار لکھے تھے ان کو دیکھ کر لکھتے ہیں کہ:۔

"وقت کی مصلحت نہیں ورنہ آپ کے اشعار پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا۔"

(۲۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء)

"آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا کہ گاندھی صاحب کا خاموش مقابلہ کہاں تک رنگ لایا کہ حکام لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات میں مارشل لاء کے

اجرا پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ فضل کرے عجیب زمانہ آرہا ہے آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں۔"

(۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء)

حالانکہ ایک اور دوست کو مارشل لا کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مگر امن پسند لوگوں کے لئے اس میں کوئی اندیشہ نہیں۔"

(۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء) مکاتیب اقبال

۱۹۲۰ء میں جب تحریک ترک موالات شروع ہوئی تو حامیانِ تحریک نے اسلامیہ کالج لاہور پر بھی حملہ کیا علامہ اقبال اس وقت کالج کے معتمد تھے اور تحریک سے اختلاف تھا۔ انھوں نے کوشش کی کہ کالج محفوظ رہے لیکن ان کی کوششیں ناکام رہیں۔

یہ ایک واقعہ تھا مگر اس ناکامی کو جو کسی تنقیص کا موجب نہ تھی اہمیت دینے کے لئے سلسلۂ بیان میں سیاسی لائف لنگار رقمطراز ہیں کہ:

"علی برادران نے علی گڑھ پر دھاوا بول دیا ہے اور مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے تحریک ترک موالات کا طوفان علی گڑھ کو ایک ذرہ بے مقدار کی مانند اپنے ساتھ بہالے گیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو علی برادران کے مقابلہ میں منھ کی کھانی پڑی۔" (۳۰۵)

سیاسی، کارنامہ کا یہ بیان مبالغہ آمیز بلکہ لغو ہے۔ حقیقت صرف یہ تھی کہ جب یہ حملہ ہوا جو کئی دن تک جاری رہا تو طلباء کی ایک قلیل جماعت نے اسلام کی آواز سمجھ کر کالج چھوڑ دیا لیکن کثیر جماعت بدستور تعلیم میں مصروف رہی اور خلفشار سے بچنے کے لئے ۲۶ اکتوبر کو کالج بند کر دیا گیا اور جب دسمبر میں کالج کھلا تو وہ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تھا اور باوجود یکہ جامعہ ملیہ جو ایک رئیس کی کوٹھی اور خیموں کی شکل میں اس کے قریب ہی قائم ہوا یونیورسٹی میں داخلے معمول پر آگئے۔ جس شدت سے حملہ ہوا تھا اتنی ہی استقامت

سے مقابلہ کیا گیا اور نتیجہ میں کچھ دنوں کے بعد ہی جامعہ کو منتقل کرنے پر مجبور کر دیا یہ تاریخی واقعہ ہے مگر مصنف سوانح نے مسخ کر دیا۔

مصنف نے قومیت کی تشکیل دو قومی نظریہ اور ہندوستان میں پارلیمانی طرز حکومت کی ناموزونی پر بحث کرتے ہوئے ان امور کو سب سے اول واضح کرنے کا امتیاز بھی علامہ کی ہی طرف منسوب کیا ہے وطنیت سے رجوع کرنے کے بیان میں رقمطراز ہیں کہ:

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں ہم کو ہندوستان کے اندر جتنے سیاسی کارکن اور مفکرین نظر آتے ہیں۔ ان سب میں اقبال ہی غالباً ایک ایسا منفرد شخص ہے جو متحدہ وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے خلاف پورے زور شور سے اپنی آواز بلند کرتا ہے، خود نواب محسن الملک اور وقار الملک اور ان کے دیگر ساتھیوں (جنھوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور اس علیحدگی پسند تحریک کی ابتداً قیادت کی) کے ذہنوں میں متحدہ وطنی قومیت اور علیحدہ مسلم قومیت کے متعلق واضح تصورات موجود نہیں تھے اور اگر یہ تصورات تھے بھی تو اصولی اور عملی نقطہ نظر سے ان کے باہمی تضاد کا انھیں واضح الفاظ میں ادراک نہیں تھا۔"

(ص ۴۰) سیاسی کارنامہ

"اقبال ہندوستان کا پہلا مفکر ہے جس نے اس علیحدگی پسند تحریک کی ابتداء میں ہی علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا کہ متحدہ وطنی قومیت اور مسلم قومیت کا آپس میں کوئی پیوند نہیں لگایا جا سکتا ......

ہندوستان کے سیاسی حالات نے اقبال کے ذہن و فکر پر اثر ڈالا یا نہیں اس مسئلہ میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اقبال کے ذہن و فکر کی اس تبدیلی نے ہندوستان کی سیاست مابعد پر

---

* یہ مصنف کا خیال ہی خیال ہے انھوں نے تو اپنی سیاست میں ان اصول پر عمل کر کے بھی پیش کئے ہیں۔

نہایت گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس کی فکر کے اس تغیر نے ہندوستان کی مسلم قومیت کی نشو و نما کے لئے ایک فلسفیانہ اساس فراہم کر دی اس کے ملی نغموں سے مسلم فرقہ میں قومیت کا شعور بھڑک اٹھا اور اس کے تفکر کے ان ہی خدوخال سے دو قومی نظریہ کا وہ نقش ابھرا جس نے بالآخر پاکستان کا نام پالیا۔" (صہ ۴۹) سیاسی کارنامہ

ہندوستان میں برطانوی جمہوریت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"برطانوی جمہوریت کا نمونہ ایک ایسے ملک کے لئے کار آمد و مفید ثابت نہیں ہو سکتا جہاں کئی قومیں رہتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانان ہند ہی وہ واحد جماعت ہندوستانی ہے جس کو بجا طور پر اور جدید معنی میں ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ ہندو اگرچہ ہر لحاظ سے ہم سے آگے بڑھے ہوتے ہیں تاہم ابھی تک وہ اس قسم کی ہم آہنگی حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں جو ایک قوم کے لئے ناگزیر ہے۔" (صہ ۱۴۳)

"علامہ اقبال عملاً بھی پارلیمانی جمہوری حکومت کو ہندوستان کے لئے موزوں و مفید خیال نہیں کرتے تھے انگلستان کا جمہوری نظام اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا تھا کہ وہاں ایک ہی قوم رہتی ہے لیکن ہندوستان کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی یہاں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں۔" (۲۲۲)

"اس لئے علامہ اقبال چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو اسی بنیاد پر طے کرنا چاہئے کہ یہاں ایک قوم نہیں بلکہ ایک سے زیادہ قومیں بستی ہیں اس لحاظ سے وہ دو قومی نظریہ جس کو بہت جلد بعد میں چل کر مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے قبول کیا جس کی بنیاد پر ہندوستان کے سیاسی دستوری مسئلہ کو ۱۹۳۰ء سے حل کرنے کی مختلف کوششیں شروع ہوئیں، دراصل علامہ اقبال کی

کی اس وطنی قومیت کی مخالفت کے بطن سے پیدا ہوا اور اس طرح ہندوستان
میں اس نظریہ کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جس وقت سے کہ علامہ
اقبال نے وطنیت کو بت پرستی سے تعبیر کیا ..... (ص ۲۱۴)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کی عملی سیاست میں دو قومی نظریہ کے
سب سے پہلے بانی تھے" (ص ۲۱۶)

افسوس ہے کہ قابل مصنف نے تاریخ ملی کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہ کی۔ اپنے تخیل پر انحصار کیا اور غلط واقعات کا طومار باندھ دیا۔

دو قومی نظریہ کی تاریخ دراصل ۱۸۵۹ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ سر سید احمد خاں نے اپنے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں جا بجا مسلمانوں کا تذکرہ بطور ایک مستقل جداگانہ قوم کے کیا ہے اور پھر انہوں نے اس نظریہ کو روز بروز وسعت دی جب وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے تو وہاں بھی اپنی تقریروں میں اسی نظریہ کو پیش کیا، لوکل سیلف گورنمنٹ کے بل پر جو بحث کی اس میں کہا کہ :-

"ہندوستان فی نفسہٖ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف
مذاہب کے آدمی بکثرت رہتے ہیں ......
ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات پات کے
اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط ہوئی ہیں ...
بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آجاوے گی"

کانگریس میں مسلمانوں کو شرکت سے روکنے میں بھی یہی نظریہ کار فرما تھا ایک بیان میں کہا کہ:-

"کانگریس درحقیقت بن ہتھیاروں کی ایک سول وار ہے، سول وار کا نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کس کے ہاتھ میں رہے، نیشنل کانگریس کا بھی
یہی مقصود ہے کہ انگلش گورنمنٹ برائے نام ہندوستانی گورنمنٹ رہے مگر

ملک کی اندرونی حکومت ان کے ہاتھ آ گئے وہ علانیہ اپنا نام نہیں لیتے مگر خوب سمجھتے ہیں کہ مسلمان تو اس لائق نہیں پھر ملک کی اندرونی حکومت انھیں کے ہاتھ میں ہے ہم بھی سول وار کو پسند کرتے ہیں مگر بن ہتھیاروں کی سول وار کو نہیں بلکہ ہتھیاروں والی سول وار اگر گورنمنٹ اندرون ملک کی حکومت اپنے ہاتھ سے منتقل کرنا پسند کرتی ہے تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ تب ایسے وہ ایک قانون مقابلہ پاس کرے اور جو قوم اس کامپیٹیشن کے امتحان میں پاس ہو اس کے ہاتھ میں اندرون ملک کی حکومت سپرد کر دے۔ مگر اس کامپیٹیشن میں دوسرے قسم کے قلم کے کام میں لانے کی اجازت دے جو ہمارے باپ دادا کے لکھنے کا قلم تھا اور جو درحقیقت ملک کی حکومت لکھنے کا قلم ہے پھر جو پاس ہو وہی ملک کی حکومت کرے۔ اگر ہمارے دوست بنگالی[1] پاس ہوں تو بیشک ان کی جوتیاں اٹھا دیں گے اور اپنے سر پر رکھیں گے مگر بغیر اس سول وار کے تو ہم اپنی قوم کو ان کی جوتیوں کے تلے روندا نا پسند نہ کریں گے۔"

پھر ۱۸۸۸ء میں مسٹر بدرالدین طیب جی کے ایک بیان کے جواب میں اپنا مفصل بیان شائع کیا اور اس میں کہا کہ :-

"یہ امر واجب ہو یا نا واجب مگر ایک مسلمان موچی سے لیکر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہ ہو گا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے کہ ہم دوسری قوم کے جو ہمارے ساتھ رہتی ہے حلقۂ غلامی میں آ جائیں۔"

جنگ یونان و ٹرکی ۱۸۹۵ء کے زمانہ میں ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ :-

"مسلمانوں میں ایک عرصۂ دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی

[1] اس زمانے میں کانگریس کے لیڈر بنگالی ہی تھے۔

علامت ہوگیا ہے اور کل مومنٍ اخوۃ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لئے وہ ہر ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔"

ان حقائق کی روشنی میں ماننا پڑتا ہے کہ دراصل سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان میں برطانوی جمہوری طرزِ حکومت کو مناسب نہیں سمجھا تھا اور دو قومی نظریہ کی وضاحت پیش کی۔

قائدِ ملت لیاقت علی خاں شہید وزیرِ اعظم پاکستان نے اپنے خطبۂ صدارت تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۵ء میں کہا کہ :-

"جب ہندوستانی سیاست اپنے ارتقائی دور کی منزل پر تھی اور عملی سیاست ایک خود اختیار حکومت کا خیال بھی ذہن میں نہ لا سکتی تھی، سرسید احمد خاں نے اپنی دوربینی کے تحت اسی وقت پُرزور الفاظ میں متنبہ کردیا تھا کہ برطانوی طرز کے پارلیمانی ادارے جن کا مدار ہم نوع قوم اور ملک پر ہے، ہندوستان جیسے مختلف الانواع ملک کے لئے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتے"، حالانکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں برادرانہ تعلقات کے قیام کے لئے بہت زیادہ حامی تھے۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے نظریہ کو برقرار رکھا انھوں نے اس خطرے کو فوراً محسوس کرلیا جو مسلمانوں کو ہندو قومیت میں مدغم ہونے سے ہو سکتا تھا اس لئے انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا:۔

سرسید نے ۱۸۹۳ء میں مسئلہ اقلیت، جمہوری سلطنت کے لوازم اور ہندوستان کی حالت بھالنے ایک بیان میں مفصل بحث کی ہے، وہ جمہوری سلطنت کی سب سے پہلی اور ضروری شرط قرار دیتے ہیں کہ :۔

اس کی آبادی میں ہم حیثیت ہو اور وہ جتنے زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ جمہوری حکومت میں ضروری خیال کرلیا جاتا ہے کہ افراد

ایسے ہی مشابہ ہیں جیسے مٹر کے دانے ....

کل دنیا کے ممالک سے ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لئے موزوں ہے، اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا چاہتی ہے ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کل اقوام ہند کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے کیونکہ اگرچہ مسلمان میناریٹی میں ہیں لیکن سب سے بڑی میناریٹی ہیں اور کم سے کم روایتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب مجارٹی ظلم کرے تو تلوار ہاتھ میں لیں جو طریقہ کہ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے بھی زیادہ تر ہے۔"

❁

سیاسی کارنامہ کے مصنف نے بھی سرسید کی تعریف کی مگر اس کو دور تیاری سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"انگریزی تعلیم نے ان کے اندر دینوی ترقی کا شوق تو پیدا کر دیا لیکن انگریزی تہذیب و معاشرت سے مرعوبیت کے باعث نوجوان نسل میں دین کی طرف سے ایک حد تک بے رُخی بلکہ بیزاری کے آثار بھی پیدا ہو گئے اور سیاسی نقطہ نظر سے ان کی حیثیت اس صغیر السن لڑکے کی مانند تھی جو ابھی تک انگریز کی انگلی پکڑے اپنا راستہ طے کر رہا ہو.... ۱۹۱۱ء سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اسی سال مولانا ابوالکلام آزاد "الہلال" جاری کرتے ہیں اور مولانا محمد علی "کامریڈ" نکالتے ہیں۔ اس زمانے میں تنسیخ بنگالہ کا اعلان ہوتا ہے اور مسجد کانپور کی شہادت کا واقعہ پیش آتا ہے...

سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات دیکھتے ہوئے
مغربی تہذیب و معاشرت کو قبول کرنے کا مشورہ دیا ان کا نعرہ تھا کہ
مغرب کی طرف۔

اقبال اور اُن کے ساتھیوں نے مغرب کی تہذیب و شائستگی کا حکمیاتی
مطالعہ کیا اور مغرب کی اجتماعی زندگی کی نفسیات کو ٹٹولا اس کے بعد
مسلمانوں کو از سر نو اسلام کی طرف پکارا۔ اس بیداری میں جدید تعلیم یافتہ
اور قدیم علماء دونوں شریک تھے علی گڑھ اور دیوبند دونوں مکاتیب خیال
کو اس تحریک نے اپنے اندر سمو لیا تھا۔ دین اور دنیا کی دوئی ختم ہو چکی
تھی، وہ دونوں یکجا آکر اس تحریک میں مل گئے تھے۔"

(سیاسی کارنامہ ۳۹۰/۳۹۴)

مصنف نے اس بیان میں سرسید اور ان کی تحریک و رفقاء پر محض اقبال کو نمایاں
کرنے کے لئے بہ تجاہل عارفانہ یا بے بصرانہ حملہ کیا ہے، سرسید کا پیغام تو یہ تھا کہ:۔

"اگر تم آسمان کے تارے ہو جاؤ اور ہماری قوم میں نہ رہو تو جو تعلق ہیں نے
جوڑا ہے وہ بالکل ٹوٹ جائے گا۔"

"سب سے اوّل ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت
اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اوّل سیڑھی ترقی قوم کی ہے قائم
رہے اور اس کے لئے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام
کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ
ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں۔"

اس غرض سے کالج میں ابتدا سے آخری درجوں تک مذہبی نظام تعلیم قائم کیا گیا مشہور
علماء مولوی شبلی، مولوی سید اکبر، مولوی خلیل احمد، مولوی عبداللہ انصاری دیوبندی،

مولوی عباس حسین اور مولوی سلیمان اشرف اور پھر وقتاً فوقتاً دیگر علماء مقرر ہوتے رہے۔ مذہبی تعلیم ہر مسلمان طالب علم پر لازمی قرار دی گئی، سیرت کی کتابوں کا نصاب میں اہتمام کیا گیا، بیرونی اصحاب سے بھی ایسے ہی لکچر دلوائے جاتے تھے حتیٰ کہ لباس تک میں قومیت کا لحاظ رکھا گیا۔ سر سید نے اس کے متعلق کہا کہ:۔

"ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی نیشنلٹی قائم کرنے کی ہے جس کو ان کے بزرگوں نے ہندوستان میں آکر ڈبو دیا ہے۔ آزاد نیشنل لباس اختیار یا ایجاد کرنا لازم ہے جو نیشنلٹی کا ظاہر کرنے والا ہو۔"

اُنھوں نے ترکی لباس کو موزوں سمجھا اور جاری کر دیا اور کس طرح کہ طلباء کو انگلش اسٹاف کے سامنے ایڈریس کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"یہ مغرور اور متعصب انگریز ہندوستانیوں کو غلامی کی حالت میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ہم کو ان متعصب اور مغرور انگریزوں پر خیال نہیں کرنا چاہیئے بلکہ خود ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ ہم کو اپنی قوم کی بہتری کے لئے کیا کرنا لازم ہے۔"

جس قدر بھی انگریزی معاشرت اپنی ضروریات کے مطابق ترمیم کر کے اختیار کی گئی اس سے اور جسارت ہی بڑھی، مذہبی تعلیم کے متعلق تو صرف اس تاریخی واقعہ کی طرف ہی اشارہ کرنا کافی ہے کہ ۱۹۰۶ء میں امیر افغانستان حبیب اللہ خان نے جب علیگڑھ کالج میں وزٹ کی تو انہوں نے اچانک طور پر طلباء کا امتحان لیا اور اس کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی تقریر میں ان غلط بیانیوں پر نفریں کی جو نوجوانان کالج کے متعلق ان سے کی گئی تھیں۔ سر سید کے ہی رفقاء اور جانشینوں کا زمانہ تھا جب کہ ۱۹۲۵ء میں بیرونی علماء نے علی گڑھ آکر طلباء کا امتحان لیا ان علماء میں مولوی ابوالکلام آزاد بھی تھے جنھوں نے نتیجۂ امتحان پر علی گڑھ کالج کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام

دنیائے اسلام میں بے نظیر تعلیم گاہ اور الیسا مرکز قرار دیا جس کی ترقی پر کل مسلمانانِ ہند کی اصلاح اور بحال دگرگوں کل مسلمانان ہند کا انسداد مبنی ہے اور طلباء نے جو جوابات دیئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو تعلیم مذہبی کا حال تھا اس پر بھی مذہب سے بیزاری کے آثار صرف مصنف سیاسی کارنامہ اور اقبال کے دیگر سوانح نگاروں کو ہی نظر آئے۔

اجتماعی زندگی میں نئے دور کا آغاز بھی علی گڑھ سے ہی ہوا۔ ۱۸۸۶ء میں تعلیمی کانفرنس کی تاسیس سے قوم میں اجتماعی زندگی پیدا کی گئی مختلف صوبوں اور اقطاع ہند میں اس کے سالانہ جلسوں کا انعقاد ایک اجتماعی زندگی کا نمونہ تھا، اس کی تقریریں اور نظمیں بھی احساسات و جذبات میں جوش و عزم پیدا کرنے میں کامیاب و نتیجہ خیز ثابت ہوتی تھیں۔

سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی علی گڑھ ہی رہبر تھا۔ سرسید نے اپنی موت تک پوری قوم کی سیاسی نمائندگی کی اور بقول قائد اعظم

" وہ درحقیقت ایک جلیل القدر انسان تھے، انھوں نے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے جو ہر مسلمان کے لئے قابل تقلید ہے .... وہ ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک کے پیش رو کی حیثیت سے اب بھی زندہ ہیں، اور ان کی سیرت کی عظمت کو ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں۔"

سیاست کوئی شریعت دائمی نہیں بلکہ واقعات و حالات کے تحت موقت ہوتی ہے، ۱۹۰۱ء میں اردو پر جو حملے ہوئے علی گڑھ نے ہی اُن کی مدافعت کی، " شملہ وفد" جو مسلم سیاست کا سنگ بنیاد ہے، علی گڑھ سے ہی مرتب

ہوا، آل انڈیا مسلم لیگ جس کی کوششوں سے پاکستان وجود میں آیا علی گڑھ نے ہی قائم کی۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ پر سب سے پہلے جو جرات مندانہ مضمون نکلا وہ علی گڑھ کالج ہی کے سیکرٹری اور مسلم لیگ کے بانی نواب وقار الملک ہی کا تھا جس نے قوم کے دل میں ایک جوشِ عزم پیدا کر دیا۔ اس میں صاف طور پر جتا دیا گیا تھا کہ حکومت کی وفاداری عرض ہے جوہر نہیں۔

طرابلس وبلقان اور خلافت کے واقعات میں علی گڑھ والے ہی ہمت کے ساتھ پیش پیش تھے، علماء کرام تو اس وقت بھی سو رہے تھے! پھر سنہ ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ والوں نے ہی ان کو سیاست کی اجتماعی زندگی میں شریک کرنے کی کوشش کی اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں انھیں کی سعی سے چند علماء شریک اجلاس ہوئے۔ صدر جلسہ نے خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ایک زمانہ دراز کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ قدیم وجدید خیالات کے لوگ اہل دنیا اور اہل دین خاص وعام اپنے مذہب کی حمایت کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں"

اس دور جدید میں زیادہ حصہ ان ہی طلباء کی سرفروشانہ جد وجہد کا تھا جو عہد سرسید کے تھے۔ اقبال تو صرف مظلومانِ طرابلس پر وہ نظمیں لکھ کر ہی خاموش ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال جس کی عربی آمیز عبارت بلیغ عام فہم نہ تھی اس زمانے کی بیداری کا باعث تھا بلکہ زمیندار اور کامریڈ اور عام مسلم پریس قومی اسباب تھے۔ اقبال تو خطوں میں بھی تفصیلی عرض سے اعراض کرتے تھے اور ان کوششوں کو سادہ لوحی سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

پھر سنہ ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک کو علی گڑھ کالج کے طلباء نے اسلام ہی کی پکار سمجھ کر لبیک کہا تھا۔ یہ جذبات علی گڑھ کی سرزمین اور اسی تحریک کے علمبرداروں کے قول وعمل سے پیدا ہوئے تھے، علامہ تو حسب بیان سوانح نگاران سنہ ۱۹۲۶ء سے میدان سیاست میں آئے۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کو علامہ کی سیاست میں نہایت نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مصنفِ ذکرِ اقبال کا بیان ہے کہ:۔

"علامہ اقبال اور بعض دوسرے بزرگوں کی تحریک سے جنوری ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی اور علامہ مسلم لیگ کی طرف سے اس میں شریک ہوئے۔"

اس کانفرنس کی روئیداد بھی اس زمانے میں شائع ہوئی اور اس میں وہ تصویر بھی شامل ہے جس میں صفِ اول میں کانفرنس کے دیگر ممتاز شرکاء کرسیوں پر ہیں اور علامہ صدر کانفرنس ہز ہائینس آغا خاں کی کرسی کے عقب میں ایستادہ صف میں نظر آتے ہیں۔ کانفرنس کی تحریک کے متعلق رپورٹ میں بیان ہے کہ:۔

"۱۰ ستمبر ۱۹۲۸ء کو شملہ میں مرکزی مقننہ کے چند ممبروں نے وقت کی سیاسی حالت اور مسلمانوں کے انتشار پر غور کر کے ایک مینی فسٹو جاری کیا جس میں ایسی کانفرنس کے انعقاد اور اہمیت پر زور دیا گیا۔ اس پر مختلف صوبوں کے سترہ ممبروں کے دستخط ہوئے۔"

کارروائی کے روحِ رواں بمبئی کے فاضل ابراہیم رحمت اللہ تھے۔ اور وہی سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ تین ماہ بعد دہلی میں ایک عظیم الشان اجلاس کی تیاری کی گئی۔ شرکت کے لئے صوبائی اور مرکزی مجالس مقننہ اور دیگر ادارہ جات سیاسی کے نمائندوں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ پنجاب سے ۲۸ اصحاب شریک ہوئے ان میں سے ایک علامہ بھی تھے جو بحیثیت ممبر مجلس مقننہ پنجاب مدعو تھے مگر وہ کسی تنظیمی مشورہ تک میں شریک نہیں تھے۔ علامہ نے کھلے اجلاس میں دیگر نمائندوں کی طرح ایک مختصر تقریر بھی کی جس میں جان سخن یہ تھی کہ:۔

"سر سید نے اب سے نصف صدی پہلے مسلمانانِ ہند کو جو راہِ عمل دکھلائی

وہ بالکل صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد اس پالیسی کی اہمیت کو ہم آج محسوس کر رہے ہیں۔"

علامہ نے بڑا زور اس امر پر دیا کہ صرف تحفظ حقوق کے لئے علیحدہ سیاسی پروگرام بنایا جائے علامہ کا نام نہ تو مسلم لیگ کے نمائندوں کی فہرست میں ہے نہ وہ کسی سبجیکٹ کمیٹی میں شریک ہیں ان کا نام صرف پنجاب کی مجلس مقننہ کے مدعو شدہ ممبروں کی فہرست میں ہے یہ شرکت محض ایک رزولیوشن کی تائیدی تقریر تک محدود تھی۔

اجلاس کے بعد مسلم لیگ کی اس وقت کی حالت سے فائدہ اٹھا کر بعض سیاسین نے اس کانفرنس کو ایک مستقل ادارہ کی صورت دیدی ان میں مولانا محمد شفیع داؤدی بہت نمایاں اور سرگرم کار تھے۔

فروری ۱۹۳۰ء میں ایک اجلاس منعقد ہوا، علامہ صدر تھے انھوں نے خطبۂ صدارت میں چند تنظیمی تجاویز ضرور پیش کیں جو خلاصۃً حسب ذیل تھیں۔

"ایک ہی سیاسی انجمن ہو ایک ہی قومی سرمایہ ہو جس کے تحت یوتھ لیگیں قائم کی جائیں اور رضاکاروں کے جیش منظم کئے جائیں اور کلچرل ادارے قائم ہوں تعلیم کی ترویج کا انتظام ہو علماء اور وکلاء کی مجلسیں قائم ہوں جن کا مقصد و کام شرع اسلام کی حفاظت ہو۔ اور بشرطِ ضرورتِ حالاتِ جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی تعبیر و تاویل کی جائے مسلمانوں کے پرسنل لا کے مسائل بھی مجالس مقننہ میں پیش ہوں زیر بحث آنے سے قبل یہ مجلس بحث و تحقیق کے تمام مراحل طے کرے۔"

لیکن ان تجاویز پر اقدام کا کوئی نشان نہیں اور جب چند سال بعد مسلم لیگ کا انتشار دور ہوا تو یہ نومولود انجمن خود بخود تحلیل ہو گئی۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

علامہ اور مسئلہ فلسطین

فلسطین کے واقعات نے تمام مسلمانوں کے قلوب میں بے چینی پیدا کر رکھی تھی اور ہر سیاسی جماعت نے صدائے ہمدردی و احتجاج بلند کی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۶ء میں مختلف صوبوں کے سرکردہ اصحاب کا ایک وفد بھی وائسرائے کے پاس گیا۔ کلکتہ میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس منعقد ہوئی۔ لکھنؤ کے اجلاس میں اس کی قرارداد کی توثیق ہوئی۔ مصر میں بھی ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں مسلم لیگ کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور انگلستان جو وفد گیا اس میں بھی دو نمائندوں (مسٹر خلیق الزماں اور عبدالرحمٰن صدیقی) نے شرکت کی اور وزیر ہند و وزیر نوآبادیات کے سامنے مسلمانان ہند کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی۔

پھر ۱۹۳۸ء میں بھی اجلاس مسلم لیگ میں یہ مسئلہ زیر بحث و توجہ رہا۔

غرض مسلم لیگ جو کر سکتی تھی اس نے کیا اور اپنے مستقل مسائل میں شامل کر لیا۔ اب علامہ کی جدوجہد دیکھئے۔ جامع و ناشر مکاتیب اپنے مقدمہ میں رقمطراز ہیں کہ :-

"حضرت علامہ کو مسئلہ فلسطین سے غایت درجہ دلچسپی تھی اور ہندوستان کے دورِ غلامی میں فلسطین کو پنجۂ اغیار سے چھڑانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مس فارقوہرسن کے نام ان کے خطوط شاہد ہیں.... مس فارقوہرسن سے تجویز کیا جا رہا ہے کہ فلسطین کے سلسلہ میں اپیل کے لئے ہز ہائینس آغا خاں کی تائید و اعانت حاصل کریں اور اپیل کا مسودہ مصر و فلسطین کے زعمائے فکر و عمل کے مشورہ سے مرتب کریں۔"

حیرت ہے کہ اس مسئلہ میں دلچسپی و اعانت کے لئے مس فارقوہرسن اور لارڈ لاتھین کا شکریہ ادا کیا جا رہا ہے گیا اس ہمدردی کی یہی کاغذات تھی؟

کہا جاتا ہے کہ علامہ اس مسئلہ پر جیل تک جانے کو تیار تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں

کہ اس کے متعلقہ جلسوں میں جو مختلف مقامات پر ہوئے قدم رنجہ نہ فرما سکے۔

ایک مقالہ نگار اپنی تمہیدی مقالہ میں مسلمانوں پر انگریزی حکومت کے مظالم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"اس صورت حال کا مسلمانوں میں ایک ردعمل تو یہ ہوا کہ ان کے مذہبی شعور رکھنے والے متوسط اور نچلے طبقوں میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور انگریز دشمنی ان کا ایک مذہبی عقیدہ بن گیا اور اسی کا دوسرا ردعمل یہ ہوا کہ سرسید اپنی زندگی کے آخری سالوں میں علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپلوں کے زیر اثر کانگریس کے ہر مطالبہ کی مخالفت کرنے لگے یہاں تک کہ وہ نیابتی طرز حکومت کے خلاف ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی فلاح اسی میں سمجھنے لگے کہ یہاں ہمیشہ ہمیشہ انگریزی حکومت رہے اور تو اور سرسید نے اس بات کی بھی مخالفت کی کہ آئی سی ایس کے مقابلہ کے امتحان ہندوستان میں ہوں آخر میں علی گڑھ کالج اور اس کی سیاسی پالیسی بالکل انگریز پرنسپل کے حوالے کر دی گئی جو اسے برطانوی استحکام کے لئے بڑے دھڑلے سے استعمال کرتا تھا"

ضیاء۔ امروز کراچی

۲۲ راپریل ۱۹۵۶ء

ہم پہلے ردّ عمل کی بحث میں نہیں جاتے کیونکہ اس کتاب کے صفحے اس کی طوالت کے متحمل نہیں ہوں گے البتہ دوسرے ردّ عمل کی نسبت اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ سرسید کے متعلق یہ غلط الزام انتہائی دیدہ دلیری سے قائم کیا گیا ہے۔ سرسید کے زمانہ میں کالج کے دو پرنسپل ہوئے ایک مسٹر تھیوڈور ماریسن جو چند سال بعد ریٹائر ہو گئے اور پھر مسٹر بیک کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے آ گئے تھے، بے شبہ جب نمائندگی کا سوال لوکل

بورڈوا) وغیرہ میں پیش ہوا تو سید محمود اور مسٹر بیک نے ایک مشترکہ یادداشت تیار کی تھی یہ

بھی خیال رہے کہ کانگریس کا سنگ بنیاد ایک انگریز نے ہی رکھا تھا اور کئی دفعہ اس کی صدارت بھی انگریزوں نے کی۔

سرسید نے جو پالیسی اختیار کی اس کی اہمیت کا احساس و اظہار علاوہ مسلم زعماء سیاست کے مولانا محمد علی صدر کانگریس ۱۹۲۳ء کے ایڈریس اور علامہ اقبال کی تقریر (آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں) دیکھا جائے۔

انگریزی حکومت یا برطانوی اقتدار کی نسبت کانگریس کے خطبات صدارت کے چند اقتباسات قابل مطالعہ ہیں:۔

(۱) "جو کچھ نصیحت ہم کو ملی ہے وہ برٹش گورنمنٹ کی بدولت ملی ہے ہم کو مردانہ وار برسر عام کہنا چاہیئے کہ ہم راج بھگت ہیں اور حکومت کے وفادار ہیں۔ ہماری رگ رگ میں راج بھگتی بھری ہوئی ہے ہم انگریزی سلطنت کے فائدوں کو سمجھتے ہیں اور ہم اس علم کی تعریف کرتے ہیں جس کی بدولت ہم اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگئے ہیں۔ یہ علم ہمیں اس وقت ملا ہے جب کہ ایشیا کے راجہ ہمارے دیس میں اپنی من مانی کر رہے تھے۔"

(بنرجی بانی کانگریس ۱۸۸۵ء)

(۲) "ہم کو مردوں کی طرح اعلان کرنا چاہیئے کہ ہم پورے طور پر وفادار حکومت ہیں۔" (نوروجی ۱۸۸۶ء)

(۳) "کانگریس کی بنیاد برٹش راج کے ساتھ وفاداری کے لئے ڈالی گئی ہے جس سے ہمارا ملک خوشحال ہے، کانگریس نے کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ ذرا بھی شبہ پیدا ہو کہ برطانوی راج الٹ دیا جائے۔" (بنرجی ۱۹۰۱ء)

(۴) جب سے کہ ہندوستان کا برطانوی تاج سے بلاواسطہ تعلق ہوا ہے ہم ہمیشہ

بادشاہ کے وفادار رہے اور ہماری وفاداری غیر متزلزل (۱۹۰۱ء)

(۵) تمام سوچنے سمجھنے والے برطانوی راج کو اللہ کی جانب سے سمجھتے ہیں۔ (۱۹۱۱ء)

☆

یہ بھی غلط ہے کہ سر سید نے ہر مطالبہ کی مخالفت کی اور سیاسی طرز حکومت کے مخالف ہو گئے بلاشبہ وہ قومی مفاد میں ہندوستان میں امتحان مقابلہ کے مخالف تھے ان کے نزدیک ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، سر سید نے یہ اختلاف ۱۸۸۷ء میں کیا تھا مگر اقبال نے تو ۱۹۲۶ء میں آئی سی الیس کے امتحانوں میں یوروپین ممتحنین کے زیادہ مقرر کرنے پر زور دیا۔ دونوں کا یہ مطالبہ مصلحتِ سیاسی وقتی کا اقتضا تھا۔

تصوّر پاکستان

سیاسی کارنامہ کے مصنف نے آخر میں ایک عنوان " اقبال کی فکر سیاسی کا شاہکار " قائم کیا ہے جس میں اقبال کے خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء کا اقتباس ہے پھر سیاسی اصلاحات وفاقی و وحدانی پر بحث کے بعد خطبۂ صدارت کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب ہے۔ یہ مسئلہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جس سے کتاب میں قطع نظر کیا گیا ہے مگر ہم اولاً اس کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو، یوں تو انتظامی نقطہ نظر سے ہندوستان کی جغرافیائی تقسیم کئی مرتبہ کی گئی اور ۱۹۰۵ء میں جو تقسیم ہوئی ممکن ہے کہ اس میں انتظام کے ساتھ سیاسی نقطۂ نگاہ بھی ہو اور لارڈ کرزن کی پالیسی سے یہ بعید بھی نہ تھا۔

اس تقسیم سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ فوائد بھی پہونچنے شروع ہوگئے اور ہندوؤں کی غلامی سے جو ہر شعبۂ زندگی پر مسلط تھی آزاد ہو جانے کا کچھ موقع ملا۔ مگر ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن کیا۔ مسلمان خاموش رہے کیونکہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے تقسیم کے قطعی ہونے کا یقین دلایا تھا لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں بادشاہ کی زبان سے اس کی تنسیخ کا اعلان ہوا تو وہ مسلمانوں پر بجلی بن کر گرا اور ان کی سیاسی پالیسی میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا اور تقسیم کے فوائد پر بھی خیالات رجوع ہوئے۔ خاص کر علی گڑھ میں جہاں ہر صوبے کے مسلمان نوجوان طلباء موجود تھے اور ان کو اب سیاست پر اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنے کی آزادی بھی تھی چونکہ یہ اعلان دماغوں پر مسلط تھا اس لئے موضوع بحث و گفتگو رہا تھا۔

اس اعلان پر خود کالج کے سیکرٹری نے ایک انقلاب آفریں مضمون لکھا تھا جو ہندوستان کے طول و عرض میں شائع ہوا۔

کالج ہی کے دو نوجوان خیری برادرز (دہلوی) ۱۹۱۴ء سے جرمنی میں نظربند تھے۔ ایمسٹرڈم میں ہندوستانی نوجوانوں کی ایک کانفرنس ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی جس میں یہ مسئلہ پیش ہوا تھا۔ جب مراسلت کی آزادی ہوئی تو ان خیری بھائیوں نے ایک خط سر تھیوڈور ماریسن کو لکھا جس میں تقسیم کے مسئلہ پر متوجہ کیا تھا۔ چونکہ سر موصوف عرصہ دراز تک علیگڑھ میں پروفیسر رہے تھے اور مسلمانوں کے حالات و جذبات اور احساسات سے پورے باخبر تھے۔ انھوں نے ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی انگلستان میں مسلمانوں کے جذبات و مقاصد کی ہمیشہ ترجمانی کی۔

اسی بناء پر اپنی کتاب "ہندوستان میں برطانوی سیاست"[1] میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر ہندوستان کے پانچ ملین مسلمان کسی صوبہ یا ملک کے کسی حصہ میں جمع کر دیئے جائیں، مثال کے طور پر شمالی ہند میں تو ایک قومی اسپرٹ ان علاقوں میں پیدا ہو جائے گی۔

---

[1] اس کا حوالہ مصنف سیاسی کارنامے نے بھی دیا ہے۔

جس سے حالیہ مسئلہ کا جزوی طور پر حل ہو سکتا ہے۔

حقیقت میں یہ کوئی اسکیم نہیں تھی مگر اس امر کی صاف شہادت ہے کہ خیالات اس طرف رجوع تھے اور جو ہندوستان بھر میں ذبیحہ گاؤ کے مسئلہ پر ہندو اہل سیاست مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے فسادات کرا رہے تھے۔ اور اس سوال کو خود گاندھی جی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے دو قدیم طالب علموں نے عبدالقدیر کے فرضی نام سے گاندھی جی کے نام بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" میں ایک کھلا خط شائع کیا جس کے آخر میں ان فسادات کے خاتمہ کا واحد علاج تقسیم ہند کو قرار دیا۔

پھر دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ علی گڑھ میں جو بموقع جشن جوبلی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا تھا یونیورسٹی پریس سے بار دوم بصورت کتاب اس خط کی اشاعت کی گئی یہ کتاب بہ اہتمام محمد مقتدی خاں شیروانی مینجر مطبع طبع ہوئی تھی اس اسکیم میں ذبیحہ گاؤ پر مفصل بحث کے بعد بیان ہے کہ :-

"مخالفت کی بنا صرف گاؤکشی ہی نہیں، بلکہ اردو، ہندی کے جھگڑے نظام سلطنت میں ہمارے حقوق کی مزاحمت، انتخاب جداگانہ سے انکار، سرکاری ملازمت وغیرہ وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پر اتحاد کے موانع ہیں اس لئے بہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد کہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھا جائے اور جانبین کے معتقدات سے تعرض نہ کیا جائے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ زبردست کمیشن مساوی التعداد ہندو مسلمانوں کے معتمد علیہ اشخاص کا مقرر کیا جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کر دے۔"

(۱) ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بناء پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کے بڑے سے بڑا حصہ اس کی آبادی کا علیحدہ کر دیا جائے اور یہ حصہ اس قوم کا حلقۂ اثر قرار دیا جائے مسلمانوں کے لئے حسب ذیل

تین صوبجات بنائے جا سکتے ہیں:۔

(الف) سرحد، مغربی پنجاب کے دس اضلاع راولپنڈی، اٹک، جہلم، گجرات شاہپور، میانوالی، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور ملتان کو ایک جا کرکے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔

(ب) بنگال میں بوگرا، رنگ پور، تاجپور، جیسور، ندباد، فرید پور، ڈھاکہ راجشاہی، پبنا، میمن سنگھ، باقر گنج نواکھالی، ٹپرا، چاٹگانگ کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

(ج) سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے علیحدہ کرکے تیسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

(۲) یہ بات اصولاً اس تقسیم کے بعد ہر حصہ ملک کا نظم و نسق اس کی کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لئے کیا جائے۔

(۳) قلیل التعداد اقوام کی حفاظت و ادائے مراسم مذہبی و حقوق ملازمت وغیرہ کے لئے قواعد مرتب کئے جائیں اور ان کے لئے قومی و سیاسی اہمیت کی بناء پر حسب ضرورت دارالامن قائم کئے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ ایک بااثر قوم ہے لیکن کسی واحد ضلع میں وہ بلحاظ آبادی کے ہنود یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے جو اس کا حلقۂ اثر بنایا جا سکے اس لئے قومی و پولیٹیکل اہمیت کی بناء پر انکے لئے ایک دارالامن قائم کیا جائے لدھیانہ اور امرتسر اس کے لئے بہت موزوں ہیں ان مقامات کا نظام حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے۔ سیالکوٹ عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ قرار دیا جائے۔ اور ان کو وہاں وہی حقوق دیئے جائیں جو سکھوں کو امرتسر اور لدھیانہ میں اسی طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کی ضرورت ہوگی۔

(۴) تبادلہ آبادی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ قلیل التعداد اقوام

کے افراد جو کسی وجہ سے ترکِ وطن کر کے خود اپنی قوم کے حلقہ اثر میں جانا چاہیں وہ بغیر زیادہ نقصان کے تبدیل سکونت کر سکیں۔

(۵) کمیشن مجوزہ کا فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت میں ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے سامنے بطور ملکی مطالبہ کے پیش کیا جائے۔

(الف) اس اسکیم کی اشاعت کے بعد اوّلین مرتبہ اسی اجلاس مسلم لیگ میں صوبہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا رزولیوشن منظور ہوا۔

ہندو مسلم زعما کے مابین مفاہمت و اتحاد کا موضوع بھی زیر غور و بحث تھا اور مذاکرات بھی جاری تھے جس کے سلسلہ میں:۔

(ب) ۱۹۲۵ء میں مولانا حسرت موہانی نے بھی یہ تجویز پیش کی کہ ہندو اور مسلم ریاستیں الگ الگ قائم کی جائیں اور مرکز میں ان دونوں ریاستوں کی ایک وفاقی حکومت ہو۔

(ج) لالہ لاجپت رائے مشہور کانگریسی لیڈر نے بھی ایک اسکیم تیار کی اور اس میں لکھا کہ:۔

میری اسکیم کے مطابق مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی۔

(۱) پٹھان صوبہ یا مشرقی و مغربی سرحد

(۲) مغربی پنجاب

(۳) سندھ

(۴) مشرقی بنگال

"اگر ہندوستان کے کسی اور حصہ میں بھی مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت ہو جس سے بہ آسانی ایک صوبہ کی تشکیل ہو سکے تو ان کو اس کی اجازت دینی چاہیئے لیکن یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی واضح تقسیم ہے"۔[۱]

---

[۱] اس تجویز کے متعلق ۱۹۴۷ء میں ایک ممتاز کانگریسی پنڈت سندر لال نے کہا تھا کہ جن کی زبان سے پہلے تقسیم کا لفظ نکلا وہ لالہ لاجپت رائے تھے۔

اسی اسکیم میں ایک موقع پر یہ وضاحت بھی کی تھی کہ ہندوستان سے باہر ہندوؤں کا کوئی دوست نہیں ہے اور اگر ہندو مسلم کسی جھگڑے میں دو پارٹیوں کی طرح مقابل ہوں تو ہندوؤں کی ایک ہی جماعت اُن کی نمائندہ ہو سکتی ہے اور وہ ہندو مہا سبھا ہے۔ میں ۷ کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا لیکن ۷ کروڑ ہندی مسلمان اور ان کے ساتھ افغانستان، مرکزی ایشیا، عرب، میسوپوٹیمیا اور ترکی کی فوجی طاقتوں کا مقابلہ ممکن نہیں ہے۔

۱۹۲۳ء میں صوبہ سرحد میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ اس کی رپورٹ میں انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے صدر سردار محمد گل خاں کا ایک صاف بیان موجود ہے جو انہوں نے کمیٹی کے سامنے شہادت کے دوران میں دیا تھا۔

کمیٹی کے ایک رکن نے ان سے سوال کیا کہ آپ کی انجمن کی بنیاد پان اسلامزم پر ہے یعنی یہ کہ اسلام ایک قسم کی جمعیت اقوام ہے اور اسی لیے صوبہ کا پنجاب میں انضمام اس مطمح نظر کے خلاف ہوگا۔ یہی تخیل آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا ہے۔

سردار صاحب نے جواب دیا کہ یہی ہے۔ لیکن مجھے کچھ اور اضافہ کرنے دیجیے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کبھی نہ ہو سکے گا۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ صوبہ علیحدہ رہے جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ میرا خیال کیا ہے تو میں بحیثیت رکن انجمن یہ ظاہر کرتا ہوں کہ ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدگی کو پسند کریں گے۔

۲۳ کروڑ ہندو جنوب میں اور آٹھ کروڑ مسلمان شمال میں، ہندوؤں کو راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ اور مسلمانوں کو آگرہ تا پشاور کا خطہ دیجیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں تبادلہ آبادی ہو۔ یہ تجویز تبادلہ کی ہے تباہی کی نہیں یہ یقیناً ناقابل عمل ہے لیکن اگر قابل عمل ہو تو ہم کسی دوسری تجویز پر اس کو ترجیح دینگے۔

پھر آخر دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں جو قرار داد منظور ہوئی وہ وفاقی طرز حکومت کی بناء پر تھی اس میں سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دیئے جانے اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ پر زور تھا۔

یہ قرارداد سر محمد شفیع (پنجاب) نے پیش کی تھی اور ہر پارٹی نے اس کی تائید کی علامہ اقبال بھی مؤیدین میں تھے۔

اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ میں قائدِ اعظم کے ۱۴ نکات مرتب ہوئے جو تقریباً قرارداد متذکرہ کے مماثل تھے۔

ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے حکومت برطانیہ نے لندن میں ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس کے اوّلین اجلاس یکم نومبر ۱۹۳۰ء سے پہلے ہی چودھری رحمت علی نے اپنی اسکیم "پاکستان" شائع کی[1]۔ ان سب کے بعد دسمبر ۱۹۳۰ء میں بمقام الہ آباد مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ ہوا اور علامہ اقبال نے خطبۂ صدارت میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس (دہلی) کی قرارداد کے متعلق کہا کہ:-

"میرے نزدیک تو اس کا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انھیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشو و نما کر سکیں پھر ان صحیح عناصر سے ایک آہنگ کل کی تخلیق ہو، اور مجھے یقین ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پرزور تائید کرے گا جو مذکورہ بالا قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں ......

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں، میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد

---

[1] قائد اعظم نے بھی اپنی تقریر اجلاس مسلم لیگ منعقدہ دہلی ۱۹۴۳ء میں کہا تھا کہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں یہ لفظ گڑھا "پنجاب سے پ، افغانستان سے الف (کیونکہ صوبہ سرحد اب تک افغانیہ کہا جاتا ہے) ک، کشمیر سے اور (س) سندھ اور (تان) بلوچستان سے اس طرح ایک لفظ بن گیا۔

اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے، ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایۂ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی لیکن اس نے ان کو اس بناء پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو ایک ریاست معرض وجود میں آجائے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہو گا۔" رائٹ آنریبل سرینواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجائے۔

میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں جتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع ملے اس لئے کہ اس قسم کے مواقع حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ حاصل ہو۔"

تعجب ہے کہ علامہ نے مشرقی بنگال کو اس طرح اپنے ذہن سے دور رکھا کہ اشارہ

؎ قائد ملت لیاقت علی خاں نے اپنے خطبہ صدارت میرٹھ ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں کہا تھا کہ "سب سے پہلے نہرو کمیٹی کے سامنے یہ تجویز آئی تھی کہ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کو ایک نظام حکومت کے ماتحت کر دیا جائے تاکہ مسلم اکثریت ایک جگہ ہو جائے۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس خیال کو ذرا وضاحت سے بیان کیا۔"

تک نہیں کیا، حالانکہ وہاں مسلم اکثریت اتنی تھی کہ لارڈ کرزن جیسے وائسرائے نے
اس کو مسلم صوبہ کہا تھا اور اس کی تقسیم کی تنسیخ مسلمانوں کی بیداری کا باعث بنی تھی۔[1]

بہر حال متذکرہ حوالوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ تقسیم ہند کا تخیل اور تصور
علامہ کا نہ تھا ان سے پہلے بھی اس کا صاف صاف اظہار ہو چکا تھا۔

علامہ نے گول میز کانفرنس کے زمانہ میں بھی جب کہ رحمت علی اسکیم کا بڑا چرچا
تھا۔ اس تقسیم کے متعلق کوئی بیان نہیں دیا البتہ ۱۹۳۲ء میں بحیثیت صدر مسلم کانفرنس
اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:

"ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت خواہ وہ وفاقی ہو قائم ہی نہ
کی جائے بلکہ ہر صوبہ کو آزاد ڈومینین بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان
کی کسی مرکزی حکومت کی بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔"[2]

نیز ۲۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو دارالعوام کے تاریخی جلسے میں مسلمانوں کے مطالبات کا بر خلاصہ
بیان کیا کہ مرکز میں ایک تہائی نشستیں، بلوچستان میں اصلاحات اور صوبائی خود مختاری۔
کانفرنس سے مراجعت پر خود علامہ نے کانفرنس میں اپنی شرکت کا یہ مقصد بیان کیا۔

"ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمان دوسری اقوام میں
مدغم نہ ہونے پائیں یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مسئلہ کے سوا گول میز کانفرنس
کی کسی دوسری کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔"[3]

اقبال نے قرطاس ابیض کے شائع ہونے کے بعد مسلمانوں کو بذریعہ مشورہ دیا کہ
اگرچہ اس فیصلہ میں ہمارے پورے مطالبات منظور نہیں کئے گئے۔ تاہم ایک
باعمل جماعت کی حیثیت سے وہ ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کہ اس فیصلہ کو
جرأت کے ساتھ قبول کریں اور اس کی حمایت کریں۔[4]

بایں ہمہ یہی سوانح نگار کہتے ہیں کہ بعض اہل الرائے سے پرائیویٹ ملاقاتیں

---

[1] ذکر اقبال صفحہ ۱۷۹، [2] ذکر اقبال صفحہ ۱۸۰، [3] ذکر اقبال صفحہ ۱۸۲ [4] ذکر اقبال صفحہ ۱۸۳

کرکے اپنی اسلامی ہندوالی تجویز کا پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ کیمبرج کے چودھری رحمت علی نے علامہ کے اس تخیل کو پاکستان کا نام دیکر ایک پاکستان نیشنل کانگریس[۱] کی بنیاد بھی رکھ دی تھی اور اس کے پمفلٹ تمام سیاسی حلقوں میں تقسیم کئے جارہے تھے۔ یعنی اہل فکر و نظر سنجیدگی سے اس پر غور کرنے لگے تھے۔

"علامہ پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے گول میز کانفرنس میں اس تجویز کو باضابطہ طور پر کیوں پیش نہیں کیا۔ جواب میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک مدرسہ فکر کامل آزادی کا حامل تھا۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی اس کے نمایاں سربراہ تھے۔ دوسرا مدرسہ خیال درجہ نوآبادیات کا قائل تھا۔ سر محمد شفیع اس مکتب کی نمائندگی کررہے تھے۔ علامہ مرحوم کا تعلق عملاً اسی دوسرے گروہ سے تھا، اور اس گروہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مقتدر مملکت کی بجائے خود مختار ریاست کے الفاظ استعمال کئے۔ پھر انہیں اس بحث سے دلچسپی بھی نہ تھی کہ ہندوستان کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے آزادی کامل کو سیاسی نصب العین قرار دینا چاہیئے یا درجہ نوآبادیات کو۔ ان کی نظر میں اہم ترین مسئلہ جو کچھ تھا وہ یہ تھا کہ اس ملک میں ایک خطۂ زمین اسلامی آئین کی جلوہ گری کے لئے علیحدہ متعین کردیا جائے اس لئے وہ مقتدر مملکت کے الفاظ استعمال کرکے انتہا پسند گروہ کی یک گونہ ہمدردی حاصل کرسکتے تھے مگر اعتدال پسند جماعتوں کی ہمدردی بالکلیہ کھودیتے اور حکمراں جماعت کی ناراضی کو اس نازک موقع پر خواہ مخواہ مول لیتے اور یہ سیاسی فراست کا کوئی اچھا مظاہرہ نہ ہوتا اس لئے انہوں نے ایسے الفاظ میں اس تصور کو پیش کیا

---

[۱] صحیح نام پاکستان نیشنل مومنٹ ہے۔

جن میں انتہا پسند و اعتدال پسند دونوں گروہوں کے نقاط نظر کی رعایت ملحوظ تھی اور یہ مقصد بھی پیش نظر تھا کہ برطانوی حکومت بھی اس تجویز کو سنتے ہی چراغ پا نہ ہو جائے۔"

(سیاسی کارنامہ ص۴۷۹)

"وقت کا تقاضا حالات کا اقتضا اور مصلحت و تدبر کا یہی مطالبہ تھا کہ علامہ مرحوم اپنی اس تجویز کو ان کانفرنسوں میں پیش نہ کرتے۔"

(سیاسی کارنامہ ص۴۸۹)

"اقبال کی فراست ایمانی نے تدبر و مصلحت کا یہی تقاضا سمجھا تھا کہ اس تجویز کو آئینی طور پر فی الحال آگے نہ بڑھایا جائے۔ گویا گول میز کانفرنس کے موقع پر اس اسکیم کو پیش نہ کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ اسکیم علامہ مرحوم کی کوئی سنجیدہ تجویز نہیں بلکہ ایک شاعرانہ ترنگ تھی یا یہ کہ وہ اس کو وفاقی اسکیم ہی کا ایک جزو سمجھتے تھے بلکہ یہ ان کے تدبر اور عملی سیاست سے مکمل واقفیت کا ایک ثبوت ہے۔"

(سیاسی کارنامہ صفحہ ۴۹۳)

"علامہ اقبال نے سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنی اس تجویز کو سنجیدگی سے پیش کرنے کے باوجود آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار داد دہلی اور سائمن کمیشن کی بعض سفارشات کی تائید اصولاً اس لئے کی تھی کہ یہ قرار داد اور یہ سفارشات مجموعی حیثیت سے علامہ اقبال کے عمومی رجحان سے قریب تر تھیں اور انہوں نے اپنی تجویز کو خود مختار ریاست کے الفاظ کا جامہ اس لئے پہنایا اور گول میز کانفرنس میں اس کو باضابطہ طریقہ پر اس لئے پیش نہیں کیا کہ عملی سیاست اور مصلحت وقت کا یہی تقاضا تھا۔"

ملے سیاسی کارنامہ ص۴۹۶

یہ جواب جس قدر ناقابل اطمینان یا پھُس پھُسے ہیں اس پر کچھ لکھنا فضول ہے ان فقرات میں "انتہا پسند و اعتدال پسندوں دونوں کے نقاط نظر کی رعایت"، "برطانوی حکومت کے چراغ پا نہ ہونے کے مقصد"، "تقاضائے حالات"، "مطالبہ مصلحت و تدبر"۔ اور "عمل سیاست" کا ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر یہ پھول خوشبو نہیں دیتے اور صرف دیکھنے ہی خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

چودہری رحمت علی اور علامہ

مگر اس بیان کے متعلق کوئی ثبوت کیا معنی کوئی صحیح اشارہ بھی نہیں کہ چودہری رحمت علی اور علامہ کے درمیان اتحادِ عمل کسی صورت میں بھی ہوا ہو، بلکہ اقبال کو چودہری رحمت علیؒ اور ان کے رفقا ایک مخالف خیال کرتے تھے کہ پاکستان کے تصور و تخیل کا کریڈٹ چودہری رحمت علی سے چھین کر اقبال کو دیا جاتا ہے۔

چنانچہ خان اے احمد نے اس مسئلہ پر "دی فونڈر آف پاکستان" کے نام سے انگلستان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا اس میں لکھتے ہیں :-

"اقبال ایک بڑے شاعر تھے لیکن وہ ایک ادنیٰ درجہ کے سیاستدان تھے جو کچھ اپنے اقوال میں وہ عطا کرتے تھے اپنے اعمال میں اس سے پھر جاتے تھے اس بات سے بعض لوگ چونک پڑتے ہیں لیکن مندرجہ ذیل واقعات اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں:

(۱) سالہا سال تک وہ مسلمانوں کے سرکاری خطابات قبول کرنے کو برا بھلا کہتے رہے لیکن جب ان کو سرکاری خطاب عطا کیا گیا تو انہوں نے دوسروں کی طرح نہایت شکر گذاری سے اسے قبول کر لیا۔

(۲) وہ مسلسل نہایت زور شور سے یہ نکتہ چینی کرتے رہے کہ کونسلیں برطانوی سامراج کے جال ہیں جو بیوقوفوں کو پھانسنے کیلئے پھیلائے

؎ چودہری رحمت علی کا اولین پمفلٹ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا جس میں لفظ پاکستان کے ایجاد کے نتائج

گئے ہیں لیکن جب موقع ہاتھ آیا تو انہوں نے خود الکشن لڑا اور تین سال تک پنجاب کی مجلس واضع قوانین کے ممبر رہے۔

(۳) مزید برآں ۱۹۳۰ء تک وہ اکثر سرکاری کانفرنسوں اور ان میں حصہ لینے والوں کا مذاق اڑاتے رہے لیکن جب ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں حکومت ہند نے انھیں گول میز کانفرنس لندن کے لئے نامزد کیا تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ اُسے قبول کر لیا اور دوسرے مسلم نمائندوں کی طرح وہاں نہایت وفاداری سے کام کرتے رہے۔

(۴) اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ہمیشہ اسلام کے مستقبل اور ملت کی قسمت سے متعلق سمجھوتہ کرنے والوں کو برا بھلا کہتے رہے لیکن جب انگریز ہندو گٹھ جوڑ نے آل انڈیا فیڈریشن کی تجویز پیش کی (وہ فیڈریشن جس کا مطلب دس کروڑ مسلمانوں کی قومی میراث اور قومی تقدیر سے دست برداری دینا تھا) تو انہوں نے پوری طرح اس مہلک وفاقی دستور کے بنانے میں تعاون کیا اور اسے قبول کر لیا۔

ان تمام واقعات سے ہمارے اخذ کردہ نتیجہ کی تصدیق ہوتی ہے اور سر محمد اقبال ویسے ہی سیاست داں ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے دوسرے سیاستداں تھے، لیکن دو باتوں کا فرق ضرور ہے

پہلی تو یہ کہ دوسرے سیاست داں جس کی دوسروں کو تلقین کرتے تھے اس پہ عمل بھی کرتے تھے، لیکن اقبال اس پر عمل کرتے تھے جسے وہ خود رد کر دیا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ ان دیگر سیاست دانوں نے پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت کی لیکن اقبال نے مخفی طور پر مخالفت کی۔

ستم ظریفی ملاحظہ ہو یہ وہ مخفی مخالفت ہی ہے جو ہمارے اخذ کردہ نتیجہ کے لئے آخری ثبوت ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب کہ اقبال کے دوست ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامسن یہ انتظام کر رہے

بنے کرن کا انتخاب آکسفورڈ یونیورسٹی میں رھوڈس کی لیکچراری پر ہو جائے تو اس وقت اقبال نے کہا تھا کہ میرے خیال میں :۔

" پاکستان کی اسکیم حکومت برطانیہ کے لئے تباہ کن ہوگی "

" ہندو قوم کے لئے تباہ کن ہوگی " اور

" مسلم قوم کے لئے تباہ کن ہوگی۔" [1]

" جب اقبال ہی کے منھ سے ایسی بات نکلی تو اس سے زیادہ فیصلہ کن اور کیا بات ہوگی اس سے تو معاملہ ہی طے ہو گیا۔ علاوہ بریں اقبال کے حمائیتوں پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر کچھ کی کچھ تاویل کرتے ہیں اور اس طرح تاریخ کے سامنے ان کا دھوکہ اور جھوٹ کھل جاتا ہے "

باب ۵

اقبال اور بعض سیاسئین

اقبال اور گاندھی جی

" اگرچہ علامہ اقبال کو قومیت متحدہ کے تصور سے اختلاف تھا، لیکن چونکہ وہ استعمار کے سخت مخالف تھے اس لئے اس اختلاف کے باوجود مجاہدین حریت کی بہادری اور اولو العزمی اور ایثار پیشگی ان کے نزدیک محبوب تھی اور وہ ان کے مخالفین کی حمایت کسی حال میں نہ کر سکتے تھے۔ انہیں دنوں علامہ نے گاندھی جی کے عزم بلند اور ان کی

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب ENLIST INDIA FOR FREEDOM)

انلسٹ انڈیا فار فریڈم مطبوعہ لندن ۱۹۴۰ء ص ۵۸ (ہندوستان کو آزادی کے لئے اپنا شریک کار بنایئے)

بے سروسامانی پر نہایت خلوص و قدردانی کے جذبے سے چند اشعار آبدار ارشاد فرمائے:

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی — کمزور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں — لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ — صرصر کی رہ گذار میں کیا عرض توتیا
پس کر ملے گا گرد رہ روزگار میں — دانا جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ بات سن کے کمال وقار سے — وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا

خارا حریف سعیٔ ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست در بنِ دنداں خلال را

(ذکر اقبال ص ١١١)

اقبال اور نہرو پنڈت جواہر لال نہرو سے اقبال کے ہی ایک خط سے مراسلت کا نشان ملتا ہے مگر موضوع و مضمون کہیں نظر نہیں آتا، البتہ ان دونوں کے مابین قادیانیت کے مسئلہ پر ایک مضمون بازی ضرور ہوئی سیاسی کارنامہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ:-

"ذہن و دماغ کے اس بُعد کے باوجود ہندو لیڈروں میں اقبال سب سے زیادہ مداح پنڈت نہرو کے ہیں وہ پنڈت جی سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اور ان کا احترام بھی (ص ٢٠)

...... جواہر کی سیاسی پالیسی سے جتنا سخت اختلاف اقبال کو ہے اتنی ہی کشادہ دلی کے ساتھ انہیں ان کے خلوص کا اعتراف بھی ہے۔ (ص ٢٠)

پھر مصنف مذکور حسب ذیل اشعار پیش کرتے ہیں:-

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد — صید را سودائے صیادی کہ داد

(ص ٢٥)

آں برہمن زادگان زندہ دل لالۂ احمر ز روئے شان خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش از نگاہ شان فرنگ اندر خروش
اصل شان از خاک دامنگیر ماست مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

اِن اشعار کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:-

"اقبال اور جواہر لال دونوں برہمن زادے ہیں، دونوں کشمیری نژاد ہیں یہ وجہ نہیں کہ اقبال نہرو کو اتنا عزیز رکھتے ہیں، بلکہ نہرو کی شخصیت میں ایک وہ آفاقی نظر آتا ہے جو اقبال کو بہت محبوب ہے کردار کی خوبیوں کے علاوہ پنڈت جی کے ذہن کی بعض خصوصیات سے بھی وہ متاثر نظر آتے ہیں، دونوں میں وسعت قلب و نظر ہے، دونوں صحیح آفاقیت اور سچی انسانیت کے قائل۔ دونوں ایشیا کی بیداری کے دل سے خواہاں۔ دونوں سرمایہ داری کے پکے مخالف اور ایک نظام نو کو برسر کار دیکھنے کے متمنی تھے ۲۷"

اقبال اور قائد اعظم

قائد اعظم اور ہز رائل ہائی نس آغاخاں کا مسلم سیاست اور مسلم لیگ میں جو مرتبہ رفیع ہے وہ محتاج بیان نہیں مگر علامہ کو قائد اعظم کی سیاست سے عرصہ تک اتفاق اور لگاؤ نہ تھا چنانچہ انہوں نے ایک طنزیہ نظم بھی لکھی جس میں ہز رائل ہائی نس آغاخاں پر بھی طعن پنجاب میں سر شفیع اور میاں سر فضل حسین کا قومی سیاسیین میں نہایت اہم کردار تھا۔ سر شفیع تو عامتہً آل انڈیا مسلم سیاست میں شریک رہے لیکن سر فضل حسین سیاست زیادہ تر پنجاب تک ہی محدود رہی۔ اقبال جب میدان سیاست میں آئے سر شفیع کے زیر سایہ رہے اور ۱۹۲۸ء میں شفیع لیگ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں صدارت اجلاس سالانہ پر انتخاب ہوا جس سے گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

سر فضل حسین نے اقبال کو جج کا عہدہ دلانے اور مجلس اقوام کی ممبری اور

ان کے دیگر اعزازات کے متعلق کوشش کی۔ غرض نائٹ ہڈ۔ صوبہ کونسل کی رکنیت۔ گول میز کانفرنس کی ممبری۔ ان دونوں کی مہربانیوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ جب تک یہ زندہ رہے اقبال کی سیاست ان ہی کے تابع رہی۔ لیکن اول سر شفیع کا اور پھر ۱۹۳۶ء میں سر فضل حسین کا جب انتقال ہوگیا تو اب علامہ نے قائد اعظم کی جانب توجہ کی مگر اس کا پس منظر یہ ہے کہ بقول مصنف ذکر اقبال :-

"ترک موالات اور سول نافرمانی کے جوش و خروش نے عامۃ المسلمین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا، مجاہد اور سرفروش قسم کے رہنما سیاست کے میدان پر قابض تھے۔ آئین پسند، تعاون پرست اکابران حالات پر مضطرب ہو رہے تھے اور اوپر کے طبقوں میں کوشش کی جارہی تھی کہ مسلم لیگ کو جواب کانگریس کا دُم چھلا بن کر اپنی ہستی کو گم کر چکی تھی از سر نو زندہ کر کے آئینی طور طریقے اختیار کئے جائیں چنانچہ سر آغا خاں اور مشیر حسین قدوائی ایک طرف خلافت کی حمایت میں بیان دے رہے تھے۔ دوسری طرف مسٹر محمد علی جناح کی وساطت سے مسلم لیگ کے احیاء کا بھی اہتمام کر رہے تھے۔ اقبال کو ان فرسودہ و ملوکانہ سیاست سے اختلاف تھا۔

انھوں نے "صدائے لیگ" کے عنوان سے چند اشعار لکھے :-

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر ۔۔۔ اترے مسیح بن کے محمد علی جناح

نکلے گی تن سے تو کہ رہیگی ہمیں بتا ۔۔۔ اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح

دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے ۔۔۔ مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح

آغا امام اور محمد علی ہے باب ۔۔۔ اس دین میں ہے ترک سواد حرم مباح

بشر نے لکم کہ منتظر ما رسیدہ است

یعنی حجاب "غیبت کبرے" دریدہ است

(ذکر اقبال ص ۱۱۱)"

اس بیان میں کوئی سنہ نہیں لکھا البتہ ابتدا کی تمہیدی سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ ہے۔ نیز حاشیہ پر ۹ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء درج ہے۔

مگر یہ زمانہ صحیح طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا، اس زمانہ میں مسلم لیگ کانگریس کا دم چھلا بنی ہوئی نہ تھی بلکہ وہ ایک مستحکم قوت تھی۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ ہوا۔ سنہ ۱۷-۱۹۱۰ء میں اس کے بڑے شاندار اجلاس کلکتہ و دہلی میں ہوئے۔

بلاشبہ کانگریس نے خلافت کے مسئلہ میں جو ہمدردی مسلمانوں سے کی تھی اس کے اثر سے باہمی اتحاد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم محمد اجمل خاں کا مشترکہ جلوس نکلا۔ لیگ کی مجلس استقبالیہ کے صدر امرتسر کے مشہور عالم مولوی ثناء اللہ تھے اس اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح لیگ کے صدر مستقل منتخب ہوئے، علامہ اقبال بھی شریک اجلاس تھے اور علی برادران کی رہائی پر ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اپنی مشہور نظم سنائی تھی

سنہ ۱۹۲۰ء میں سالانہ اجلاس ناگپور و احمد آباد میں منعقد ہوئے۔ ہندو مسلم اتحاد پر کانگریس اور لیگ دونوں کی کامل توجہ تھی، گاندھی جی کی حق پرستی اور دیگر اوصاف پر سب ہی کا اتفاق تھا۔ علامہ نے بھی اپنی ایک نظم میں "وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا" کہہ کر اعتراف کیا ہے غرض اس زمانے کی تاریخ سوانح نگار کی تائید نہیں کرتی۔

البتہ ۱۹۲۷ء میں ہز ہائینس آغا خاں نے ایک مینی فسٹو جاری کر کے مسلمانوں کو اتحادِ ملی پر توجہ دلائی تھی کیونکہ نہرو رپورٹ پر خود مسلمانوں میں دو فریق ہو گئے تھے ایک اس کا حامی تھا اور دوسرا مخالف تھا۔

سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی۔ اور اس کے بعد ہی چودہ نکات کا فارمولا جو قائد اعظم نے تیار کیا تھا مسلم لیگ کا نصب العین بن گیا۔ البتہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی شرکت کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے لندن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

لیکن ۱۹۳۳ء میں واپس آگئے اور اعیان سیاست کے اصرار سے پھر انہوں نے لیگ کی صدارت منظور کرلی اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور ایک مرکز پر مجتمع ہونے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ تاآنکہ ۱۹۳۴ء میں تمام اختلافات رفع ہوگئے اور لیگ کی جدید تنظیم کے سلسلہ میں وہ لاہور بھی گئے۔ میاں سرفضل حسین ان کے عظیم ترین مخالف تھے اور پنجاب کا کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ قائداعظم جب لاہور پہنچے تو سرفضل حسین نے ملاقات تک نہ کی بلکہ یہ پیغام بھیجا کہ:۔

"پنجاب سے ہاتھ الگ رکھیے اس کی قسمت یونینسٹ پارٹی کے سپرد ہے۔"

علامہ نے بھی قائداعظم کی کوئی تائید وامداد نہ کی بلکہ دراصل اس نظم مندرجہ بالا سے استقبال کیا۔ علامہ پنڈت نہرو کے قدیم مخلص مداحوں میں تھے اور اس زمانے میں ان سے مراسلت کا سلسلہ جاری تھا چنانچہ سرسید راس مسعود کو لکھتے ہیں کہ:۔

"پنڈت جواہر لال نہرو کا خط آیا تھا۔ آجکل مسٹر محمد علی جناح لاہور آئے ہوئے ہیں یہاں کی مختلف پارٹیوں کے اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں۔"

(۲۰ مئی ۱۹۳۶ء)

بہرحال لاہور میں ان حالات کے باوجود مسلم لیگ کا ایک شاندار اجلاس منعقد ہوا جس میں قائداعظم نے ایک معرکۃ الآراء اور بصیرت افروز تاریخی تقریر کی۔

غالباً اسی موقع پر علامہ نے دوسرا قطعہ ارشاد فرمایا ہے جو "محمد علی باب" کے عنوان سے مجموعہ میں موجود ہے۔

تھی خوب حضور علما باب کی تقریر ۔۔۔ بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعراب سماوات
اس کی غلطی پر علما تھے متبسم ۔۔۔ بولا تمہیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری ہی قرأت کے تصدق میں ہیں آزاد ۔۔۔ محبوس تھے اعراب میں قرآن کی آیات

اتفاق کہ کچھ عرصہ بعد ہی سرفضل حسین کا انتقال ہوگیا، ادھر لیگ کی قوت بھی روز افزوں زور پکڑ رہی تھی اور قائداعظم پر عامۃ المسلمین کا اعتماد تھا کہ علامہ اپنے ایک بیان

کے ساتھ جس میں قائدِ اعظم کی تعریف و تنقید بھی سفرِ سیاسیات پر جلوہ گر ہوئے اور مئی ۱۹۳۶ء
سے سلسلہ مراسلت شروع کر دیا۔ پھر علامہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر بھی منتخب ہوئے
مگر اس عہدے سے جلد ہی بیزار ہو گئے چنانچہ اس سلسلہ میں سر سید راس مسعود کو لکھتے ہیں۔

"تمہارا خط ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے میرا بھی یہی فیصلہ ہے جو تم نے کیا ہے یہ واقعی اور اٹل ہے، میں نے تو پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا ہے بورڈ کی میٹنگ کل ہو گی۔ آج کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں جو نوٹ اس استعفیٰ پر نکلا ہے ممکن ہے تمہارے ملاحظہ سے گزرا ہو۔ بورڈ کے ممبر اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے اسے ملتوی کر دوں بہر حال اس ماہ کے اختتام تک میں اس کی صدارت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔"

(۳۰ اگست ۱۹۳۶ء)

مراسلت

علامہ کی مراسلت میں چند خطوط بصیغۂ راز بھی ہیں جن میں سر سکندر حیات خاں وغیرہ کے متعلق کچھ اطلاعات ہیں جو سر فضل حسین اور سر شفیع کے سیاسی جانشین تھے۔

پنڈت جواہر لال کی ایک تقریر پر توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

بصیغۂ راز مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

۱۔ "آپ کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقیات کے پیش نظر دستور جدید ہندی مسلمانوں کو اپنی تنظیم کے لئے ایک نادر موقع بہم پہنچاتا ہے۔"

(دستور کی تائید کرتے ہیں)

۲۔ "۲۰ر اپریل ۳۷ء کے خط میں ایک نیشنل کنونشن کا اجلاس منعقد کرنے کا مشورہ ہے۔"

۳۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں معاشی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، اسلام ہندوستان میں ان مسائل کے حل بہ آسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا ایک سے زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

۴۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں ہندو مسلم مساوات پر اظہار خیال ہے اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلم وزارت مسلمانوں سے ناانصافی برتنے پر مجبور ہوتی ہے اس کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دستور جدید ہندوؤں کی ہی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے ..... موجودہ دستور ہندی مسلمانوں کے لئے زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے ....

ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اسی طریق پر ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ ..... ہندوستان کا امن نسلی، مذہبی اور لسانی میلانات کی بناء پر ملک کی تقسیم مکرر پر موقوف ہے۔"

۵۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کے خط میں لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی درخواست کی ہے۔

۶۔ ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے خط میں کمیونل ایوارڈ کے متعلق ایک قرارداد کا مشورہ ہے، اور مسئلہ فلسطین پر اظہار اضطراب، اور لیگ میں قرارداد اور راہ عمل متعین کرنے کی اہمیت کے اظہار کے بعد لکھتے ہیں:

"ذاتی طور پر میں کسی امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام والوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔"

۷۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کی تنظیم کے لئے کوشش اور قوتوں کو وقف کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"اس وقت تک دم نہ لینا چاہیئے جب تک کہ پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہو جاتی اور بلوچستان کو اصلاحات نہیں ملتیں"

۸۔ یکم نومبر ۱۹۳۶ء بصیغۂ راز۔ سر سکندر اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے متعلق بعض اطلاعات

۹۔ ۱۰ / نومبر ۱۹۳۷ء (راز)

"سر سکندر اور ان کے دوستوں سے متعدد گفتگوؤں کے بعد اب میری قطعی رائے ہے کہ سر سکندر لیگ اور پارلیمنٹری بورڈ پر اپنا پورا قبضہ چاہتے ہیں ..... مجھے تو اس تمام کھیل کا مقصد لیگ پر پہلے قبضہ جمانا اور پھر اس کا جنازہ نکال دینے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا ...."

۱۰۔ ۲۰ / مارچ ۱۹۳۷ء تک علامہ دستور جدید کو جو گول میز کانفرنس کا نتیجہ تھا ایک نادر موقع بتاتے ہیں پھر وہ ایک آزاد اسلامی مملکت یا پاکستان کا نظریہ پیش نہیں کرتے بلکہ ہندوستان کی تقسیم مکرر اور مسلم صوبوں کا ایک جداگانہ وفاق اور پھر پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت اور بلوچستان کی اصلاحات پر زور دیتے ہیں۔

غرض نہ تو ان خطوط میں علامہ نے آزاد مملکت کا خیال ظاہر کیا اور نہ گول میز کانفرنس کے زمانے میں انہوں نے پرائیویٹ طور پر پروپیگنڈا کیا۔

واقعہ ہے کہ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مخالفین کا لاہور میں بھی مقابلہ کرتے بلکہ خط بھی بصیغۂ راز لکھے ہیں۔

پھر یہ کہ مسلم لیگ کے اجلاس جو لکھنؤ و پٹنہ وغیرہ میں منعقد ہوئے ان میں شرکت کر کے کوئی نظم یا تقریر اثر ڈالنے کے لئے نہیں فرمائی صرف مشوروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

وہ فلسطین کے مسئلہ پر تو جیل جانے کو تیار نظر آتے ہیں مگر ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلہ میں گول کمرہ کے اندر قلمی مشورہ اور بعض اوقات دروازہ

بند کر کے پیش کرتے ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ۳۶ء میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ان کے قدم سے محروم ہی رہی۔ جس کے لئے جیل جانے کو بھی تیار تھے۔

ان خطوط کے ملاحظہ کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ ۲ مئی ۳۶ء کو سر سید راس مسعود کے نام جو خط ہے اس میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میری صحت خدا کے فضل سے بحال ہو گئی ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس بیماری سے پہلے جو حالت تھی وہ عود کر آئی ہے"۔۔۔۔۔

اسی طرح دوسرے خطوط میں بھی تندرستی کا ذکر ہے، بیماری بھی عارضی نہیں تھی۔

نوٹ:۔ مکاتیب اقبال کے مجموعہ میں اور جداگانہ بھی یہ خطوط شائع ہوئے ہیں قائداعظم کا پیش لفظ بھی ہے جو کسی درخواست پر لکھا ہے اس کے آخر میں تحریر ہے کہ:۔

"ان کے نظریات بنیادی طور پر میرے نظریات کے ہم آہنگ تھے اور میرے لئے ان نظریات نے وہ ہی نتائج پیدا کئے جو ہندوستان کے آئینی مسائل کے دقیق مطالعہ سے نکلتے تھے اور ان کا اظہار کچھ عرصہ میں مسلم انڈیا کے متحدہ عزم میں ہوا جیسا کہ لاہور کے آل انڈیا مسلم لیگ کے رزولیشن میں ظاہر کیا گیا"

اقبال اور ہز ہائینس آغا خاں

اقبال اور ہز ہائینس آغا خاں میں کوئی قریبی تعلق نہ تھا لیکن اقبال کی دلچسپی کے متضاد آثار ضرور ملتے ہیں۔

مسلم لیگ پر ان کی جو طنزیہ نظم ہے اس میں سر آغا خاں کو بھی امام بنا کر ایک نشانہ بنایا ہے لیکن امامت کی تعریف ایک اور نظم میں کی ہے:۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھکو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اسکی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

۱۹۱۹ء میں پیرس کی صلح کانفرنس کے موقع پر جب ہز ہائینس آغا خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک وفد کو انگلستان آنے کا مشورہ دیا تھا تو علامہ نے لکھا کہ :-

شام کی سرحد سے رخصت ہو وہ رندِ لم یزل
اسکے مینخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو کس درجہ ہے حیرت کا مقام
رنگ اک پل میں بدلدیتا ہے یہ نیلی رواق
حضرتِ کرزن کو اب فکرِ مدا وا ہے ضرور
حکم برداری کے معدے میں ہے دردِ لا یطاق
وفد ہندوستان سے کرتے ہیں آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پئے ہضم فلسطین و عراق

مگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں شرکائے کانفرنس کا جو گروپ لیا گیا ہے اس میں صدر اجلاس سر آغا خاں کی کرسی کے عقب میں علامہ اقبال ایستادہ ہیں۔

پھر مئی ۱۹۳۲ء میں مس فارقوہرسن کو لکھتے ہیں کہ :-

"جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے میں ایک اپیل شائع کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں میں نے پہلے بھی آپ کو لکھا کہ ہز ہائینس آغا خاں کی اعانت حاصل کریں۔ ایسی اپیل میں ان کی شمولیت نہایت موثر ثابت ہوگی۔"

۱۹۳۵ء میں سید راس مسعود کے توسط سے خواہشمند ہیں کہ ہز ہائینس سر آغاخاں اُن کے فرزند جاوید کو تاختم تعلیم وظیفہ عطا کریں۔ اسی سال مولوی سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے، میں نے آغاخاں کو باوجود اُن کی تمام کمزوریوں کے ان سب سے بہتر مسلمان پایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے ان کے حالات میں انقلاب عظیم آرہا ہے۔

باب ۶

اقبال کے اُستادِ محترم

"ذکر اقبال" میں اقبال کے استاد محترم حضرت مولانا حافظ میر حسن شاہ کے حالات بھی ہیں۔

لیکن جیسا کہ بعض مصنفین اپنے صاحب سوانح کی عظمت دکھلانے کے لئے دوسروں کو موردِ طعن وحقارت بنا لیتے ہیں اور اس کے لئے بے سروپا روایات لکھنے پر دلیر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ذکر اقبال میں بھی بعض روایات منقول اور بعض نئی نظر آتی ہیں۔"

اس سلسلے میں یہ روایت عجیب وغریب ہے کہ:۔

"۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج فاونڈیشن میں حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے تھے، سر سید نے وائسرائے کے اعزاز میں ایک بہت بڑا ڈنر دیا، شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا لیکن آپ نے کہا کہ میں ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہو سکتا، چنانچہ سر سید نے اپنے فرزند سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور کہا کہ جب تک شاہ صاحب کھانا کھائیں ان کی خدمت میں حاضر رہنا اور ان کی باتیں سننا۔" (ص ۲۷)

بظاہر کس قدر صاف روایت ہے مگر اب ذرا محکِ تنقید پر لائیے،

مولانا نے نہ تو " ایسی دعوتوں " کی تصریح کی نہ مجبوری ظاہر کی بلکہ ایک کھڑا جواب دیا حالانکہ مولانا سرسید کے بڑے ارادتمند تھے اور سرسید عمر میں ان سے بہت بڑے اور مرتبہ میں ان سے بہت بلند مقام رکھتے تھے ظاہر ہے کہ والسرائے کے ڈنر میں مغربی طریق پر کھانا ہوگا اور مولانا چھری کانٹے کے استعمال میں مشاق نہ ہونگے، اس لئے بہتر طریقہ یہ تھا کہ ادب کے ساتھ معذرت کر لیتے،

دوسرا حصہ دیکھئے:۔ سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور حاضر رہنے اور باتیں سننے کی ہدایت کی، سید محمود خود مشرقی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے اور مولانا کے تقریباً ہم عمر تھے اور اس وقت ہائیکورٹ کے جج تھے پھر یہ کہ سرے سے ڈنر کا وجود ہی نہ تھا وائسرائے ۹ بجے آیا اور تمام مراسم ادا کر کے ۳ بجے روانہ ہو گیا" یہ روایت محض مولانا کی عظمت دکھانے کے لئے تراشی گئی ہے:۔

مشرقی تہذیب، تعلیم اور تدریس میں اُستاد کا حفظ مرتبہ اور ادب بڑی اہمیت رکھتا ہے مگر ملاحظہ ہو کہ:۔

"ایک مرتبہ اقبال شاہ صاحب کے ساتھ چلے جا رہے تھے اور سبق پڑھ رہے تھے ایک ہاتھ میں کتاب تھی دوسرے میں بٹیر، شاہ صاحب نے پوچھا کمبخت اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بے تکلف بولے حضرت ذرا پکڑ کر دیکھیے، شاہ صاحب ہنس دیئے"

راستہ چلتے میں سبق، دونوں ہاتھ گھرے ہوئے بٹیر اور کتاب، مولانا کا سوال اور علامہ کا جواب اور وہ بھی حضرت استاد کو!! (ص ۲۸۵)

مولانا کی بذلہ سنجیوں کی روایتوں میں ایک روایت یہ ہے کہ:۔

"ایک مرتبہ سرسید آئے تو گرمیوں کا موسم تھا لو چل رہی تھی، شاہ صاحب پاس بیٹھے تھے، سرسید نے کہا کہ کیا یہی پنجاب ہے جسے انتخاب ہفت کشور

---

۱ نوٹ:۔ ولادت سرسید ۱۸۱۷ء، ولادت مولانا ۱۸۴۴ء ولادت سید محمود ۱۸۵۰ء۔

کہتے ہیں، شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں اگر ہندوستان جنت نشان" ہے تو "پنجاب ضرور انتخاب ہفت کشور ہے"۔ (ص ۲۸۶)

لطیفہ کتنا ہی دلچسپ ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے موسم گرما میں کبھی پنجاب کا سفر نہیں کیا پہلی مرتبہ ۱۸۷۳ء میں دوسری مرتبہ ۱۸۸۴ء میں مختلف مقامات پر گئے تیسری مرتبہ ۱۸۸۸ء میں کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر جو لاہور میں منعقد ہوا۔ نیز ۱۸۹۵ء میں انجمن کے جلسہ میں اور یہ تمام سفر موسم سرما میں کئے ہیں۔

اس لطیفہ میں سرسید کو محض عظمتِ بیان و زیب داستان کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ (ص ۲۷)

اسی طرح ایک اور روایت دیکھئے کہ:۔

"۱۸۹۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا شاہ صاحب کے پاس ممبری کا ٹکٹ تھا جو اتفاق سے گم ہو گیا، دروازہ پر رضا کاروں نے روک دیا۔ اتنے میں نواب محسن الملک کی نظر پڑ گئی انھوں نے پکار کر رضا کاروں سے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو ایسے بزرگ کو روکتے ہو جس نے کانفرنس قائم کی ہے" (ص ۲۷)

اوّل تو کانفرنس کا کوئی اجلاس ۱۸۹۵ء میں لاہور میں نہیں ہوا، دو اجلاس ہوئے ہیں ایک ۱۸۸۸ء میں دوسرا ۱۸۹۸ء میں مگر نواب محسن الملک پہلے اجلاس کے موقع پر حیدر آباد میں تھے، اور دوسرا اجلاس بڑا شاندار رہا تھا، لاہور میں اس شان کا یہ پہلا اجلاس تھا کہ جس کی ریسپشن کمیٹی میں پنجاب کے ممتاز اصحاب شریک تھے یہ اجلاس گورنر پنجاب کے درباری خیمہ میں منعقد ہوا تھا۔ ممبروں ڈیلیگیٹوں اور وزیٹروں کا تعلق اسی کمیٹی سے تھا اسی کا انتظام دروازہ پر بھی تھا۔ مولانا سے لاہور کے اصحاب ناواقف نہ تھے بڑے مجمع میں رضا کاروں کا روکنا اور نواب محسن الملک کا نظر پڑ جانا اور انکا رضا کاروں کو متنبہ کرنا اور خلاف واقعہ کہنا کسی طرح قرینِ عقل نہیں

کانفرنس کی پوری تاریخ میں کوئی شائبہ بھی نہیں کہ مولانا کو اُن کے بانیوں میں شمار کیا جاتا البتہ کبھی کبھی عام ممبروں کی طرح فیس ممبری بھیج دیتے تھے!

پھر یہ کہ اگر یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے تو بجائے عظمت کے مولانا کی کسرِ شان پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کہ ایسی بزرگ ہستی کے مرتبہ سے رضاکاران مقامی بھی واقف نہ تھے؟

مولانا کو نوروز ۱۹۲۳ء پر شمس العلما کا خطاب ملا۔ اس کے بارے میں سوانح نگار اقبال لکھتے ہیں کہ:۔

"علامہ اقبال کی پرزور سفارش تھی، جب خود اُن کے خطاب کے متعلق گورنر نے ان سے گفتگو کی ہے تو اس میں یہ مسئلہ بھی داخل تھا بقول مصنف سیرت اقبال حکومت نے ۱۹۲۳ء میں آپ کو نائٹ کا خطاب پیش کیا یہاں اقبال کی فراخ حوصلگی اور بے نیازی کا یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب آپ کو سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے کہا کہ میں خطاب صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں جبکہ میرے استاد کو اوّل شمس العلماء کا خطاب دیا جائے گا۔ گورنمنٹ کو اس شرط کے ماننے میں تامل تھا کہ علامہ میر حسن مرحوم باہمہ علم و فضل کسی غیر معمولی شہرت کے مالک نہ تھے لیکن اقبال نے اپنی شرط پوری کرا ہی لی اور اپنی نائٹ ہڈ کے ساتھ مولوی صاحب کو شمس العلما بنوا دیا۔" (ص ۱۶)

مگر ذکر اقبال کے مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

"میکلاگن نے علامہ سے دریافت کیا کہ آیا آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلما کے خطاب کے لئے موزوں ہے، علامہ نے فرمایا کہ میں ایک شرط پر نام پیش کرنے کو تیار ہوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے، میکلاگن نے کسی قدر تامل کے بعد شرط

قبول کرلی، علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک مولوی میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے بہترین مستحق ہیں۔ میکلاگن نے کہا کہ میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے۔ کیا انھوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں وہ میرے استاد محترم ہیں"۔ (ص ۱۲۰)

پہلے بیان میں حکومت اور گورنمنٹ ہے، دوسرے میں گورنر موصوف کا نام ہے، بیانات میں بھی تباین ہے پہلے میں اقبال کی شرط ہے دوسرے میں خود گورنر کا استصواب ہے، بہرحال ایسی روایت کے راوی دو ہی ہو سکتے ہیں گورنر یا خود اقبال، اگر اقبال نے یہ قصہ بیان کیا تو نام لکھنے میں سوانح نگار کیوں تامل کرتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ مولانا میر حسن ایک مشن کالج کے تقریباً پچاس سال سے علوم مشرقی کے پروفیسر تھے پرنسپل اور اسٹاف کی نظر میں ان کی عزت تھی، سررشتہ تعلیم کے افسروں میں وہ احترام رکھتے تھے ان کے صاحبزادے سید علی نقی شاہ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر کے عہدے پر ممتاز تھے، اور اس جگہ عام آدمی مقرر نہیں ہو سکتا، گورنمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا ہوتا ہے، علاوہ ازیں اقبال کے ماسوا تلامذہ میں دیگر بہت سے ممتاز اصحاب اور سرکاری عہدہ دار، تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر، کمشنر، جج اور جج ہائیکورٹ بھی تھے۔ اس لئے مولانا میر حسن صاحب اقبال کی سفارش کے محتاج نہ تھے، پھر یہ کہ ان کی سفارش کرنے والا سب سے بڑا تو پرنسپل تھا۔ . . . . اور یہ کوئی لازمی چیز نہیں کہ کتابوں کی تصنیف بھی ہو، علی گڑھ میں مولوی عباس حسین اور مولوی خلیل احمد کو اور لاہور میں مولوی عبداللہ ٹونکی کو بغیر تصنیفی شہرت کے خطابات ملے تھے، اور یہ سب سررشتہ تعلیم ہی سے متعلق تھے اس لئے علامہ اقبال کا نام دوسری بے سروپا روایتوں کی طرح محض قرب زمانہ کے سبب سے داخل کر دیا گیا مولانا کو ۱۹۲۲ء میں اور اقبال کو ۱۹۲۳ء میں خطاب ملا تھا۔

اقبال کی رحلت

اقبال کا انتقال درحقیقت ایک سانحہ عالمگیر تھا مسلم دنیا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا ایک متاع گرانمایہ سے محروم ہوگئی۔ لیکن ان کے ایک عقیدت مند حمید احمد خاں صاحب نے ایک عجیب مجہول بیان پیش کیا ہے۔

"اقبال کی وفات پر لاہور کے ایک مقتدر انگریز افسر نے اقبال کے ایک عقیدت مند سے کہا کہ تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپرد خاک کر دیا۔" یہ مقتدر مگر مجہول انگریز تو خیر انگریز ہی تھا لیکن یہ عقیدتمند بزرگ تو مسلمان تھے کیا ان کو اپنی نسبت بھی یقین ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔

گویا ۲۰ر اپریل ۱۹۳۸ء کو ہندوستان میں صرف ایک ہی مسلمان رہ گیا تھا سو اس کو بھی سپرد خاک کر دیا گیا۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ہ)

محمد اشرف خاں رکن ادارہ احسان بروایت آغا مرتضیٰ خاں مدیر احسان رقمطراز ہیں کہ:

"رات کے ۳ بجے کا وقت تھا چارپائی پر لیٹے لیٹے یکایک دل میں ایک ٹھیس سی لگی اور بیقراری میں اضافہ ہو گیا میں چارپائی سے اٹھا کپڑے پہنے اور حضوری باغ کی طرف روانہ ہو گیا ناقابل بیان کشش مجھے علامہ مرحوم کی قبر پر لئے جا رہی تھی جب میں قبر پر پہنچا تو لاہور کا ایک مجذوب بزرگ جسے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں قبر پر بیٹھا ہوا بڑبڑا رہا تھا میں نے فاتحہ پڑھا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا، میرے دل پر خوف طاری ہو گیا مجذوب کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں میں فاتحہ خوانی سے فارغ ہوا تو اس سے پوچھا بابا ایوب تم اس وقت کہاں چکر لگا رہے ہو؟ اس نے جواب کڑکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ تجھے معلوم نہیں آج حضور نبی کریم صلعم کی سواری اس طرف سے گزر رہی ہے، اور میں پہرہ دار مقرر ہوا ہوں، مجھے مجذوب کی ان باتوں سے خوف آ رہا تھا، اور

باوجود ہوا کے تیز جھونکوں کے میرا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور جسم بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے چپل ہاتھ میں پکڑی اور بھاگ نکلا، گھر پہونچا لیکن صبح تک میرے حواس درست نہ ہوئے۔ لیکن میرے دل کو پوری پوری تسکین حاصل تھی۔" (ص ۳۹ سیرت اقبال)

۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنے مقالہ اقبال اور ملّا میں رقمطراز ہیں کہ :-

"یورپ اور امریکہ کے پاگل خانوں میں اور امراض نفس کے شفاخانوں میں بڑی کثرت سے اپنے آپ کو مسیح سمجھنے والے ملتے ہیں، یہ مجانین اگر مشرق میں ہوتے خصوصاً خطۂ پنجاب میں تو ان میں سے کوئی دیوانہ بکار خویش ہوشیار ضرور اچھی خاصی امت پیدا کر لیتا، علامہ اقبال پنجاب کے زندہ دل ہونے کے قائل تھے اور اس کے سادہ دل عوام کی خوبیوں کو تسلیم کرتے تھے لیکن یہ حقیقت انکو بڑی جاں گداز معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ جلد کسی اقتدار پسند مذہب کے پیرو بن کر تن من دھن کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان اس کو پنجاب بھر میں سرفروش مرید ملتے ہیں۔ . . ."

ان بیانات کو غور سے پڑھنے کے بعد دیکھئے کہ اقبال کی وفات کے بعد ان کے معتقدین اور سوانح نگار ان کو کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں۔